MUD-008

کلاسیکی اردو شاعری

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

2

اردو کے نمائندہ قصیدہ نگار اور متن کی تدریس و تفہیم

بلاک 2 کا تعارف

اکائی 5
مرزا محمد رفیع سوداؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل) 73

اکائی 6
شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر) 93

اکائی 7
مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار) 111

اکائی 8
محمد محسنؔ کاکوروی: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل) 127

بلاک 2 تعارف

بلاک ۲ 'اُردو کے نمائندہ قصیدہ نگاروں کی قصیدہ نگاری' سے متعلق ہے جس میں پانچ سے آٹھ تک اکائیاں شامل ہیں۔

پانچویں اکائی بعنوان (مرزا محمد رفیع سوداؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) ہے۔ اس میں اُردو کے عظیم المرتبت قصیدہ نگار مرزا محمد رفیع سوداؔ کے سوانحی احوال و کوائف پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری کے فنی محاسن سے بحث کی گئی ہے اور ان کے مشہور قصیدہ 'اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل' کے منتخب اشعار کی تشریح بھی پیش کی گئی ہے۔

چھٹی اکائی کا عنوان (شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) ہے۔ اس میں اُردو کے ممتاز قصیدہ نگار شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سوانحی احوال و کوائف کو بیان کرتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری کے فنی امتیازات سے بحث کی گئی ہے اور ان کے مشہور قصیدہ 'زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر' کے منتخب اشعار کی تفہیم کی سعی کی گئی ہے۔

ساتویں اکائی بعنوان (مرزا اسداللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) ہے۔ اس میں مرزا غالبؔ کے سوانحی احوال و کوائف پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری کے فنی محاسن پر گفتگو کی گئی ہے اور ان کے مشہور قصیدہ 'ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار' کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔

آٹھویں اکائی کا عنوان (محمد محسنؔ کاکوروی: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) ہے۔ اس میں محسنؔ کاکوروی کے سوانحی احوال و کوائف کو بیان کرتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری کے فنی محاسن اور انفرادیت سے بحث کی گئی ہے اور ان کے مشہور قصیدہ 'سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل' کے منتخب اشعار کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

اکائی 5 مرزا محمد رفیع سوداؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم
(اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل)

ساخت

5.1 اغراض و مقاصد

5.2 تمہید

5.3 مرزا محمد رفیع سوداؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

5.3.1 مرزا محمد رفیع سوداؔ کے سوانحی احوال و کوائف

5.3.2 مرزا محمد رفیع سوداؔ کی قصیدہ نگاری

5.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

5.3.4 ماحصل

5.4 آپ نے کیا سیکھا؟

5.5 اپنا امتحان خود لیجیے

5.6 سوالوں کے جوابات

5.7 فرہنگ

5.8 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مرزا محمد رفیع سوداؔ کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے۔
- مرزا محمد رفیع سوداؔ کی قصیدہ نگاری سے بحث کریں گے۔
- مرزا محمد رفیع سوداؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- مرزا محمد رفیع سوداؔ کے قصیدہ ٔباب الجنت در منقبت حضرت علیؑ کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے۔
- مرزا محمد رفیع سوداؔ کے قصیدہ ٔباب الجنت در منقبت حضرت علیؑ کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھیں گے۔

5.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائیوں میں آپ نے قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی، فنی خصوصیات، اس کی اقسام و

موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔ آپ نے اس کی ادبی وتہذیبی اہمیت کو بھی سمجھا اور اس کے ارتقا کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں۔ اب دوسرے بلاک کی اس پہلی اکائی میں آپ اُردو کے عظیم المرتبت قصیدہ نگار مرزا محمد رفیع سوؔدا کے سوانحی احوال وکوائف سے واقف ہوں گے، ان کی قصیدہ نگاری سے بحث کریں گے اور ان کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے، ساتھ ہی ان کے مشہور قصیدہ 'باب الجنت در منقبت حضرت علیؓ کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح کو سمجھیں گے۔

5.3 مرزا محمد رفیع سوؔدا: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

5.3.1 مرزا محمد رفیع سوؔدا کے سوانحی احوال وکوائف

مرزا محمد رفیع سوؔدا ۱۷۱۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا واجداد بخارا سے ہندوستان تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے ان کے آبا واجداد فن سپہ گری میں مہارت رکھتے تھے۔ سوؔدا کے والد مرزا محمد شفیع دہلی میں پیدا ہوئے جو پیشے سے ایک مشہور تاجر تھے۔ سوؔدا کی تعلیم وتربیت دہلی میں ہی ہوئی۔ انھوں نے اپنے زمانے میں رائج علوم کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ فارسی زبان پر کمال حاصل ہونے کی وجہ سے انھوں نے شعر گوئی کا آغاز فارسی شاعری سے کیا۔ فارسی شاعری میں ان کے استاد سراج الدین علی خان آرؔزو تھے۔ ان کے مشورے پر ہی سوؔدا نے اُردو شاعری کی طرف توجہ کی۔ خان آرؔزو کے بعد سوؔدا نے پہلے سلیمان قلی خان وؔداد اور پھر شاہ حاتؔم کی شاگردی اختیار کی۔ سوؔدا کے ابتدائی حالات کے بارے میں اگر چہ زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں لیکن اس بات کے پختہ شواہد ملتے ہیں کہ سوؔدا نے اپنا بچپن عیش وعشرت کے ساتھ گزارا۔ انتقال کے وقت سوؔدا کے والد اچھی خاصی دولت چھوڑ گئے تھے جس کو سوؔدا نے یار باشی میں لُٹا دیا۔ اس کے بعد معاشی تنگی کے باعث فوج میں ملازمت کر لی لیکن بہت جلد فوج کی ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ سوؔدا کی طبیعت بچپن سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنی پوری توجہ شعر گوئی کی طرف مرکوز کر لی اور وہ اپنا بیش تر وقت بسنت خان خواجہ سرا، احمد علی خان اور عماد الملک وغیرہ کی صحبت میں گزارنے لگے۔ ان کا زیادہ تر وقت امرا و رؤسا کی صحبت میں گزرتا تھا۔ اس لیے طبیعت میں شان وشوکت اور رئیسانہ وضع داری پیدا ہو گئی اور کئی رئیسانہ اوصاف ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن گئے۔ موسیقی میں دل چسپی رکھنے کے علاوہ ان کا اہم شوق کتے پالنا بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آخری ایام تک سوؔدا کے پاس کئی اعلیٰ نسل کے کتے موجود تھے۔

سوؔدا مہذب، شریف، خوش اخلاق اور خوش گفتار انسان تھے جس کی وجہ سے امرا اور رؤسا کے درمیان انھوں نے بہ آسانی اپنی ایک خاص جگہ بنالی۔ زندہ دلی، یار باشی اور دوست نوازی کے سبب ان کے احباب کا حلقہ وسیع تھا۔ اپنے زمانے کے اکثر چھوٹے بڑے شعرا سے ان کے مراسم رہے ہیں لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود سوؔدا خوددار اور انتہائی نازک مزاج بھی تھے۔ خلافِ طبع کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی کے سبب سوؔدا کی

مرزا محمد رفیع سوداؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل)

اپنے معاصرین سے ادبی چشمک بھی رہی ہے اور انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کی ہجویں لکھی ہیں جن میں میر تقی میرؔ، میر غلام حسین ضاحکؔ، مرزا فاخر مکیںؔ، قیام الدین قائمؔ اور ندرت کاشمیری وغیرہ شامل ہیں۔

سوداؔ کے زمانے میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے متواتر حملوں کے علاوہ روہیلوں، مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے ہاتھوں دلی برباد ہو رہی تھی۔ ہر طرف قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ دہلی کے ابتر سیاسی اور معاشی حالات کی وجہ سے اہلِ ہنر اور شعرا دلی چھوڑ کر دوسری جگہوں پر ہجرت کرنے کے لیے مجبور ہو گئے جن میں خان آرزوؔ، میر تقی میرؔ، قیام الدین قائمؔ، قلندر بخش جرأتؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشاء اللہ خان انشاؔ اور سعادت یار خان رنگینؔ جیسے شعرا شامل تھے۔ دلی کے ناسازگار حالات کے سبب سوداؔ بھی عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد چلے آئے۔ یہاں نواب احمد بخش خان کے دیوان مہربان خان رندؔ کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ مہربان خان خود شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور اہلِ فن کی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے سوداؔ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں سوداؔ نے کئی سال فراغت اور اطمینان کے ساتھ گزارے۔ اس کے بعد سوداؔ شجاع الدولہ کی دعوت پر فیض آباد چلے آئے جہاں شجاع الدولہ نے دو سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا جو آصف الدولہ کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ آصف الدولہ کی سرکار سے سوداؔ کو چھے ہزار روپے سالانہ ملتے تھے۔ اس طرح سوداؔ نے دلی سے لے کر لکھنو تک ایک خوش حال زندگی گزاری۔ انھوں نے کبھی معاشی تنگ دستی کا سامنا نہیں کیا۔ جب ناموافق حالات کی وجہ سے ان کو دلی کو چھوڑ کر فرخ آباد کا رُخ کرنا پڑا، اس وقت بھی ان کو آسائشیں میسر رہیں اور اس کے بعد بھی۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب آصف الدولہ جانشین ہو گئے۔ آصف الدولہ نے جب دار السلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو سوداؔ نے بھی لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی اور لکھنؤ میں ہی ۲۷ جون ۱۷۸۱ء میں اُردو کے اس عظیم الشان شاعر کا انتقال ہوا جنھیں امام باڑہ باقر علی میں دفنایا گیا۔

5.3.2 مرزا محمد رفیع سوداؔ کی قصیدہ نگاری

مرزا محمد رفیع سوداؔ کا شمار اہم کلاسیکی شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُردو قصیدہ نگاری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے زمانے کو اُردو شاعری کے سنہرے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مرزا سوداؔ کو اگر چہ اُردو غزل میں کمال حاصل تھا لیکن ان کی اصل شہرت اور مقبولیت کا دارو مدار قصیدہ نگاری پر ہے۔ سوداؔ کے سامنے اُردو کے ابتدائی قصیدوں کے مقابلے فارسی کے عمدہ قصائد موجود تھے۔ ایسے میں ان کی طبیعت پر فارسی قصائد کا اثر پڑنا فطری تھا۔ چنانچہ انھوں نے عرفیؔ اور خاقانیؔ کی سنگلاخ زمینوں کو اپنایا اور بے حد کامیاب قصیدے لکھے۔ مثال کے طور پر عرفیؔ کا مشہور لامیہ قصیدہ ہے:

چہرہ پرواز جہاں رفت کشد چوں بہ محل　　شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

(عرؔفی)

اس زمین اور قافیہ میں سوؔدا نے بھی طبع آزمائی کی اور حضرت علیؓ کی شان میں اپنا مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل　　تیغِ اُردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

(سوؔدا)

عرؔفی کے علاوہ انورؔی جو کہ ہجویہ قصیدے کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے، اس کی تقلید میں سوؔدا کا ہجویہ قصیدہ 'تضحیکِ روزگار' بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ خاقاؔنی کی زمین میں بھی سوؔدا کا بہت مشہور اور کامیاب قصیدہ ملتا ہے۔

نثار اشک من ہر شب شکر ریز است پنہانی　　کہ ہمت راز ناشؤست بازانو و پیشانی

(خاقاؔنی)

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی　　نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

(سوؔدا)

سوؔدا کے اس قصیدے کے مطلع، تشبیب اور گریز میں جدت وندرت ملتی ہے مگر قصیدے کا نعتیہ حصہ کمزور ہے۔ سوؔدا کو اپنی قصیدہ نگاری پر بڑا ناز تھا۔ عرؔفی و انورؔی، سعدؔی اور خاقاؔنی سے وہ اپنے آپ کو رتبے میں کم نہیں سمجھتے تھے۔ اس بات کا اظہار اپنے ایک شعر میں اس طرح کرتے ہیں:

انوری، سعدی و خاقانی و مداح ترا　　رتبۂ شعر وسخن میں ہیں چاروں ایک

سوؔدا نے اپنے متعدد قصیدوں کے موضوعات فارسی سے مستعار لیے ہیں تاہم ان کے قصائد میں بیان کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو قصیدے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری میں سوؔدا کے قصیدوں کو منفرد مقام حاصل ہے۔ سوؔدا کے یہاں دنیاوی ممدوحین کی تعداد کثرت سے ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مذہبی شخصیات کے علاوہ امرا اور رؤسا کی شان میں متعدد قصائد ملتے ہیں۔ بعض قصائد ہجویہ ہیں۔ کچھ قصیدے ایسے بھی ہیں جو واقعاتی نوعیت کے ہیں۔ ان قصیدوں میں سوؔدا نے اپنے عہد کی تاریخ اور معاشرتی حالات کو قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے بسنت خان، آصف الدولہ، عماد الملک، سیف الدولہ، سرور الدولہ، حسن رضا خان اور رچرڈ جانسن وغیرہ جیسے صاحبِ اقتدار شخصیات کی مدح میں قصیدے کہے ہیں۔ محمد حسین آزؔاد نے 'آبِ حیات' میں سوؔدا کے قصیدوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پس اول قصائد کا کہنا پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر

پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عناں درعناں ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ان کے کلام کا زور وشور انوریؔ اور خاقانیؔ کو دباتا اور نزاکتِ مضمون میں عرفیؔ اور ظہوریؔ کو شرماتا ہے۔''

(محمد حسین آزادؔ، آبِ حیات، اتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء، ص:۱۰۶)

سوؔدا کے قصائد میں تشبیب سے لے کر دعا اور حسنِ طلب تک کے اشعار میں قصیدہ گوئی کے تمام فنی لوازمات پائے جاتے ہیں۔ان کے قصیدوں میں زبان کی شان وشوکت، بلند تخیل، مضمون آفرینی، جدت بیانی اور مبالغہ آرائی جیسے تمام عناصر کثرت سے موجود ہیں۔ان کے قصیدوں میں روانی و برجستگی کا یہ عالم ہے کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔سوؔدا کو اس بات کا اندازہ تھا کہ انھوں نے قصیدے کے فرسودہ موضوعات کو نیا رنگ ورُوپ عطا کیا ہے۔شجاع الدولہ کی شان میں لکھے گئے قصیدے جس کی ردیف 'رنگ ڈھنگ' ہے، کے مطلع کے ایک شعر میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے درسخن کو دیا سنگ رنگ ڈھنگ　　　تھا ورنہ اس رقم میں کب اس رنگ رنگ ڈھنگ

کسی بھی قصیدہ نگار کی فن کاری کا مظاہرہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے تشبیب، گریز، مدح اور حسن طلب اور دعا کے اشعار میں کس فنی مہارت وپختگی کا ثبوت دیا ہے۔اس لحاظ سے سوؔدا کامیاب نظر آتے ہیں۔

تشبیب:

سوؔدا نے اپنے قصیدوں کی تشبیب میں موضوع کی مناسبت سے نئے نئے مضامین نظم کیے ہیں۔ان کے قصیدوں کی تشبیب میں بہاریہ، نشاطیہ، فلسفیانہ، متصوفانہ، عاشقانہ، رندانہ اور حکیمانہ وغیرہ موضوعات ملتے ہیں۔قصیدے کے لیے یہ بات ضروری خیال کی جاتی ہے کہ اس کا مطلع چونکانے والا ہوتا کہ قاری پورا قصیدہ پڑھنے پر مجبور ہوجائے۔اس ضمن میں شیخ چاند رقم طراز ہیں:

''خیال کی ندرت، بیان کی جدت اور زبان کی شگفتگی و برجستگی مطلع میں نہ ہو تو وہ کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔''

(شیخ چاند، سوؔدا، انجمن پریس، کراچی، بار دوم، ۱۹۶۳ء، ص:۱۸۶)

سوؔدا کے بیش تر قصیدوں کے مطلعے مذکورہ خوبیوں سے آراستہ نظر آتے ہیں۔نواب عماد الدولہ کے مدحیہ قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو:

کہے ہے کاتب دوراں سے منشی تقدیر　　　سمجھ کے دفتر قسمت کیا کرا ب تحریر

حضرت امام حسنؓ کے منقبتی قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو:

ہوا ہے دشت برنگ چمن طرب مانوس　　نگہ غزالاں کی جیوں شاخ سبز ہے محسوس

سوؔدا کی طبیعت کا جوہر بہاریہ تشبیب میں زیادہ کھلتا ہے۔انھوں نے بہاریہ تشبیب میں اپنی جودتِ طبع دکھاتے ہوئے فارسی قصیدہ نگاروں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ایک بہاریہ تشبیب میں پھولوں کا بیان نہایت دل کش انداز میں ملتا ہے:

ادھر کو لعل کے ساغر میں ارغوانی مے　　بھری ہے لالہ حمرا نے ہو خوش وخرم

ایک قصیدے کی تشبیب میں سوؔدا نے مکالماتی انداز اختیار کر کے ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے۔ایک قصیدے کی تشبیب میں غیر مجسم چیزوں کو مجسم بنا کر پیش کیا ہے۔خوشی شاعر کو خواب میں جلوہ دکھاتی ہے اور دونوں کے درمیان سوال و جواب ہوتا ہے۔اشعار ملاحظہ کیجیے:

فجر ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک　　وہیں آ کے خوشی نے دی در دل پہ دستک

پوچھا میں کون ہے؟ بولی کہ میں وہ ہوں غافل　　نہ لگے شوق میں جس کے کبھی شائق کی پلک

ہے خوشی نام میرا، میں ہوں عزیز دلہا　　زندگانی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ سے

کھول آغوش دل اور لے مجھے جلدی ناداں　　پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک

اسی طرح سوؔدا نے عقل وحرص اور نصیحت کو بھی مکالماتی انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے قصیدوں کی زبان پُرشکوہ ہوتی ہے۔وہ بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال سے قصیدے میں زور پیدا کرتے ہیں۔ان کے قصیدوں میں زبان و بیان کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔انھوں نے اپنے بلند تخیل کی بنا پر قصیدوں میں چار چاند لگائے ہیں۔تشبیب اور مدح میں موضوعات اور مختلف صفات کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے نادر تشبیہات و استعارات، حسنِ تعلیل اور مبالغے کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔شاعرانہ وسائل کے فن کارانہ استعمال سے ان کے قصیدوں میں دل کشی اور معنوی تہہ داری پیدا ہوگئی ہے۔اس کے علاوہ سوؔدا کے قصیدوں میں فارسی الفاظ و محاورات اور ہندی الفاظ کا خوب صورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔انھوں نے اپنے قصیدوں میں ہندی الفاظ کو اس مہارت سے استعمال کیا ہے کہ قرأت کے دوران کہیں بھی اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ان کے قصائد میں زبان و بیان کی ہنرمندی قابلِ تحسین ہے۔

گریز:

سوداؔ کے قصائد کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے گریز میں انتہائی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ بعض قصیدوں میں ایسا لگتا ہے کہ بات سے بات پیدا ہوگئی اور کب ممدوح کا ذکر آیا، پڑھنے والے کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ گریز میں سوداؔ نے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ کبھی وہ اپنے شاعرانہ کمالات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے نکتہ چینوں کی شکایت کرتے ہیں اور پھر شکوہ وشکایت کو فضول سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ فلاں ممدوح کے مداح ہوتے ہوئے شکوہ شکایات کی کوئی ضرورت نہیں۔ نصاب میں شامل قصیدہ کی گریز کا یہ شعر دیکھیے جس میں سوداؔ نے اپنے سخن کی شیرینی ورنگینی کا ذکر کر کے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اس کا سبب حضرت علیؑ کی تعریف ہے:

ہے مجھے فیضِ سخن اس کی ہی مداحی کا　　　ذات پر جس کے مبرہن کنہ عزو جل

گریز کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو جس میں نواب آصف الدولہ کی سال گرہ کے موقع پر خوشی سے مکالمہ ادا کروایا گیا ہے:

آج اس شخص کی ہے سال گرہ کی شادی　　　کہ بہ صورت ہے وہ انسان و بہ سیرت ہے ملک

یعنی نواب سلیماں فرو نام آصف جاہ　　　عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک

مدح:

مدح قصیدے کا سب سے اہم جزو ہے جس میں شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کرتا ہے۔ سوداؔ اپنے ممدوح کی تعریف میں مبالغہ آرائی اور صناعی سے اس قدر کام لیتے ہیں کہ ممدوح کی اصل حیثیت معدوم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سوداؔ قصیدوں میں دنیاوی اور مذہبی ممدوح کے حفظِ مراتب کا خیال اکثر بھول جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے قصیدوں کے ممدوحین میں ایک جیسی صفات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر شجاع الدولہ اور حضرت علیؑ کی مدح میں لکھے گئے قصیدوں کو اگر ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ دونوں ممدوحین کی خصوصیات کم وبیش ایک جیسی ہیں۔ سوداؔ اپنے ممدوح کے اوصاف اور ساز وسامان بیان کرنے میں حسنِ تعلیل، مبالغہ کی آمیزش، انوکھی اور دل چسپ تشبیہات واستعارات سے لطف پیدا کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں لیکن ان کے قصائد پر اکثر وبیش تر یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ ان کا مدح والا حصہ پُر اثر نہیں ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی مبالغہ آمیزی کی وجہ سے مذہبی اور دنیاوی ممدوحین کی صفات میں فرق وامتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں قصیدے کا ممدوح کوئی بھی ہو مگر صفات مشترک پائی جاتی ہیں۔ بزرگوں کی شان میں لکھے گئے ان کے قصیدوں میں شرافت، بزرگی، نیکی، فیوض وبرکات، عدل وانصاف اور کشف وکرامات کا ذکر ہے۔ وہیں امراو سلاطین کی شان میں لکھے گئے ان کے قصیدے سخاوت وفیاضی، ہیبت وجلال اور عدل وانصاف جیسے اوصاف کے علاوہ تلوار، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ کی خوبیوں کے ذکر پر مبنی ہیں۔ حضرت علیؑ کے عدل وانصاف کو دیکھیے جس

میں جدت وندرت ملتی ہے:

ہیبت عدل یہ تری ہے کہ ہر دشت میں شیر　　واسطے درد سر آہو کے گھسے ہے صندل

عماد الملک کی مدح میں لکھے گئے قصیدے کی یہ مثال ملاحظہ ہو جس میں ان کی ہیبت وجلال کا ذکر پُر زور انداز میں کیا گیا ہے:

تجھ کو للکار کے میداں میں صف مرداں کے　　سامنے آئے ترے کون ہے ایسا مردک

وہ سیف الدولہ کے گھوڑے کی شوخی اور برق رفتاری کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

اس حصر میں کرے ہے وی اس طرح شوخیاں　　تڑپے ہے جوں نسیم چمن میں ہو بے قرار

مشرق کی سرزمیں سے مغرب کی سمت کو　　اس برق وش کو پھینک دے گر ہو کے تو سوار

حسنِ طلب اور دعا:

مدح کے بعد قصیدہ نگار اپنے ممدوح سے اپنی ضرورت یا حاجت کا ذکر کرتا ہے اور ممدوح کی ترقی، خوشی اور درازیِ عمر وغیرہ کے حق میں دعا کرنے کے بعد قصیدے کو انجام تک پہنچاتا ہے۔ دعا والے حصے میں قصیدہ نگار کو بڑی احتیاط اور فن کاری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ سوداؔ نے اپنے اکثر قصائد میں حسنِ طلب سے کم اور دعا سے زیادہ کام لیا ہے۔ دنیاوی ممدوحین کی کثیر تعداد کے باوجود بھی حسنِ طلب کے معاملے میں سوداؔ کے قصیدے کمزور نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ممدوح کے آگے کھل کر مانگنے اور دستِ طلب دراز کرنے سے گریز کیا ہے۔ البتہ کچھ خاص ممدوحین کے آگے وہ اپنے گوہرِ مقصود کو نہایت خوبی سے بیان کرتے ہیں جن میں سرفراز الدولہ، غازی الدین خان وزیر، آصف الدولہ اور بسنت خاں وغیرہ شامل ہیں۔ سرفراز الدولہ کے مدحیہ قصیدے میں اظہارِ مدعا کا انداز دیکھیے جو مبالغہ آمیز ہوتے ہوئے بھی سادگیِ بیان کا عمدہ نمونہ بن گیا ہے:

عوض میں اس کے صلہ کے کروں میں تجھ سے عرض　　قبول ہو جو مرا حرف اے ذوی الاکرام

مجھے تو گوشۂ خاطر میں اپنے دے جگہ　　کہ تا بسر کروں لیل و نہار با آرام

اسی طرح بسنت خاں کی مدح میں لکھے گئے قصیدے میں وہ دعا کا نرالا انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اتنی ہی آرزو ہے، کچھ عمر ہو جو باقی　　مصرف جہاں میں اس کا تیری قدم کے یاں ہو

کب جاسکے ہے کوئی دروازے تیرے آکر　　بیٹھے جو تیرے در پر وہ سنگ آستاں ہو

مذکورہ بیانات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سوداؔ کے قصائد شکوہِ الفاظ، ندرتِ بیان، بلندی خیال، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کے ساتھ ساتھ فن کا بہترین نمونہ ہیں۔ سوداؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اُردو قصائد کو فارسی قصیدوں کے ہم پلہ کردیا۔ اسی سبب فارسی کے بڑے بڑے قصیدہ نگاروں مثلاً عرفیؔ، انوریؔ اور خاقانیؔ کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ مصحفیؔ نے سوداؔ کو قصیدے کا نقاشِ اول کہا ہے۔

5.3.3 متن کی تدریس وتفہیم

(قصیدہ باب الجنت درمنقبت حضرت علیؑ : منتخب اشعار)

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمردار ہر ایک — دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عزوجل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک پھول سے لے کرتا پھل
واسطے خلعت نو روز کے ہر باغ کے بیچ — آب جو قطع کرنے لگی روش پر مخمل
بخشتی ہے گل نو رستہ کی رنگ آمیزی — پوشش چھینٹ قلم کار، بہ ہر دشت و جبل
تارے بارش میں پروتے ہیں گہرہائے تگرگ — ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بار سے، آب رواں، عکس ہجوم گل کے — لوٹے ہے سبزے پر، از بس کے ہوا ہے بے کل
شاخ میں گل کی یہ نزاکت بہم پہنچی ہے — شمع ساں، گرمی نظارہ سے، جاتی ہے پگھل
سایہ برگ ہے اس لطف سے ہریک گل پر — ساغر لعل میں جوں کیجئے زمرد کو حل
فیض تاثیر ہوا ہے یہ کہ اب حنظل سے — شہد ٹپکے، جو لگے نشتر زنبور عسل
ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مداحی کا — ذات پر جس کی مبرہن کنہ عز و جل
مہر سے جس کی منور ہے دل جوں خورشید — رو سیہ کینے سے جس کے، رہے مانند زحل
شیر یزداں، شہ مرداں، علی عالی قدر — وصی ختم رسل، اور امام اول
خاک نعلین کی جس کے، مدد طالع سے — پہنچے اس شخص کو، جو شخص ہو اعمائے ازل
وہ نظر آئے اسے، دہر کی بینائی سے — رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجھل
مدح غائب سے کھلے اس کے نہ مداح کا دل — رو بہ رو مطلع ثانی سے یہ ہو عقدہ حل
علم تیرا نہیں کچھ علم خدا سے باہر — ہے عمل بھی وہی تیرا، جو خدا کا ہے عمل
رائے تیری کے موافق جو نہ لکھے نسخہ — کرے تاثیر نہ عیسی کا مداوا بہ کسل
وصف تجھ تیغ دو سر کا میں کروں کیا شہ دیں — دل مجنوں کے جو میداں میں کرے ہے صیقل
اس کے قبضے پہ جو ہو دست مبارک تیرا — نہ رہیں دی محمد کے سوا اور ملل
کھینچے اسے، گرتو عدو پر کرے میداں میں نہیب — استقامت کا زمانے کی، قدم جائے نکل

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اس کو آسیب نہیں صورت شمشیر قضا
نہ جھڑے وہ، نہ مڑے وہ، نہ پڑے اس میں بل

اس کی جلدی کا تو کیا ذکر ہے سبحان اللہ
نسبت اس کی، فرس ایسا، کہ جسے کہیے اچل

توسن وہم کو دوڑایئے ساتھ اس کے،تو ہو
بازگشت اس کی تمام،اس کے بہ گام اول

ہیبت عدل یہ تیری ہے کہ ہر دشت میں شیر
واسطے درد سر آہو کے،گھسے ہے صندل

سامنے بز کے یہ کیا دخل کہ نکلے آواز
گرگ کے پوست کو منڈھوا کے بجائے جو دہل

مورد سنگ ہو شیشہ،تو غضب سے کر دے
کوہ کو ہر دو کف دست میں مل کر، خر دل

مرغ زرین فلک ،عہد میں تیرے شاید
بوجھ کر دانہ، گیا ہے کسی اختر کو نگل

تارتار اس کے جو یہ بال و پر آتے ہیں نظر
باز قدرت نے ترے، پنجے سے ڈالا ہے مسل

امر حق سے جو ملائک نے یہ چاہا، سونپیں
حلم کا بار تیرے، کوہ و فلک کو بہ ازل

عرض دونوں نے کیا یوں جناب اقدس
بوجھ اس میں ہے بہت،ہم ہیں گرفتار کسل

آخرش تجھ کو ہی پایا متحمل اس کا
جب یہ دیکھا کہ کسی سے نہیں سکتا ہے سنبھل

کر کے دریافت اس احوال کو، اب یا مولا
تجھ سے یوں عرض کرے ہے یہ ترا عبد اقل

یہ نہ کر مجھ کو گوارا، کہ گزند اس کے سے
ہند کی خاک میں اجزائے بدن ،جاویں گل

جلد پہنچا بہ زمین نجف،اس عاصی کو
کہ اسی عمر ابد ہے وہ،جو واں آئے اجل

مجھ کو کچھ عذر نہیں اس میں،ترا ہوں میں غلام
بہل و تعذیر سے تیری نہیں سکتا میں نکل

مدعا اتنی عرائض کا مری، ہے یہ عرض
سر فرو ہو، نہ مرا یاں، بہ در اہل دول

میری قسمت کے موافق تو معین کر دے
اپنی سرکار سے، واں ما یتحلل کا بدل

چاہتا ہے کرے آخر وہ دعائیہ پر
نظم تجھ مدح کی،بہتر ز کلام اول

بوئے گل، مست کرے باغ میں تا بلبل کو
تا کرے باد سحر،عقدے کو غنچے کے حل

تا مسمار ہے یہ نظم بہ باب الجنت
جب تلک اس سے بر آوے مری امید و امل

نخل امید سے،تیرے،ہوں برو مند محبّ
ہو محبت نہ تری جن کو، نہ پاویں وہ پھل

عزیز طلبا! ابھی آپ نے سوداؔ کے قصیدہ ’باب الجنت در منقبت حضرت علیؑ‘ کے جن منتخب اشعار کی قرأت کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

یہ قصیدہ حضرت علیؓ کی مدح میں لکھا گیا ایک منقبتی قصیدہ ہے۔۱۵۳ اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ کافی طویل ہے۔اس قصیدے کی تشبیب، گریز، مدح اور دعا کے منتخب اشعار کی تشریح پیش خدمت ہے۔اس قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے۔شروع کے دس اشعار تشبیب کے ہیں جن میں موسمِ بہار کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔تشبیب کے

تمام اشعار پہلے شعر سے جڑے ہوئے ہیں۔ پہلا شعر دیکھیے کتنا دل چسپ ہے۔ اس میں سوداؔ نے ایرانی مہینوں کے نام لیے ہیں۔ بہمن گیارہواں اور دے دسواں مہینہ ہے۔ ان مہینوں میں موسمِ خزاں کا آغاز ہوتا ہے۔ اُردی دوسرا مہینہ ہے یعنی فروری کا مہینہ جس میں موسمِ بہار شروع ہوتا ہے۔ مستاصل جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔ دیکھیے ایک معمولی سی بات کو کہنے کے لیے سوداؔ نے نامانوس الفاظ استعمال کیے ہیں جس کی وجہ سے قصیدہ شکوہِ بیان کا بہترین نمونہ بن گیا ہے۔ اس شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ بہار کی تلوار نے خزاں کے موسم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے اور چمن یعنی پھولوں کے باغ سے بہمن و دے یعنی خزاں کے مہینوں کا عمل دخل ختم ہو گیا ہے۔ دوسرے شعر میں بھی موسمِ بہار کی دل چسپ منظر کشی کی گئی ہے۔ بہار کے موسم کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ چاروں طرف سرسبزی و شادابی، نمی، ہریالی اور پھول ہی پھول کھلے ہوتے ہیں۔ موسمِ بہار میں درختوں کی شاخوں پر پھل لدے ہونے کی وجہ سے شاخیں جھک جاتی ہیں۔ یہاں سوداؔ نے حسنِ تعلیل سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے ٹہنیوں کے جھکے ہونے کی یہ علت بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہار کی شکل میں جو تحفہ اس دنیا کو دیا ہے، اس پر درخت کی ٹہنیاں جھک کر خدا کا شکر ادا کر رہی ہیں۔ تیسرے شعر میں بہار کی آمد کا اثر نباتات کی شکل میں ظاہر کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیڑ، پودوں اور درختوں کی شاخ، پتے، پھول اور پھل میں قوتِ نامیہ (بڑھنے کی قوت، نمو پذیری) کا اثر کچھ زیادہ ہی دکھائی دے رہا ہے۔ یعنی بہت تیزی سے درختوں پر برگ و بار نکل آئے ہیں۔ چوتھے شعر میں نوروز کا ذکر ہے۔ نوروز ایرانیوں کے مطابق سال کا پہلا دن ہے جس کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اس شعر میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ خلعتِ نوروز یعنی نوروز کے لباس کے لیے ہر باغ کے بیچ میں مخمل کا فرش یعنی سبزہ اُگا ہوا ہے اور آبِ جُو یعنی چھوٹی نہر کی روش پر بھی گھاس اُگ آئی ہے۔ یعنی باغ کی ہر چیز کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ بھی نوروز کا جشن منا رہی ہے۔ پانچویں شعر میں موسمِ بہار کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جنگلوں اور پہاڑوں میں رنگ برنگ گل نورستہ (نئے پھول جو بہار کے موسم میں اُگتے ہیں) کھلے ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی قلم کار (مصور) نے پوشش چھینٹ یعنی رنگ برنگ گل بوٹوں سے بنا ہوا خوش نما لباس پہنا دیا ہو۔ چھٹا شعر منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں یہ دکھایا جا رہا ہے کہ مسلسل بارش ہو رہی ہے اور اوپر سے (گہر ہائے تگرگ) موتی جیسے اولے پڑ رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہر طرف بادل موتیوں کی شکل میں ہار بنا رہا ہے تاکہ یہ ہار درختوں کو پہنایا جا سکے۔ ساتویں شعر میں حسنِ تعلیل اور مبالغے کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اب ذرا تصور کیجیے کہ نہر کے بہتے ہوئے پانی پر (ہجومِ گل) سینکڑوں پھولوں کا عکس پڑ رہا ہے جس کے بوجھ سے بہتا ہوا پانی سبزے پر بے قرار ہو کر لوٹ رہا ہے تاکہ اس کو چین مل سکے۔ اصل علت یہ ہے کہ نہر پانی سے لبریز ہے جس کی وجہ سے گھاس پر بھی پانی بہنے لگا ہے۔

آٹھویں شعر میں شاعر کے تخیل کا کمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس میں پھولوں کی نزاکت کو بیان کرنے کے لیے یہ کہا جا رہا ہے کہ پھول اور اس کی شاخوں کی نزاکت اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ نظارگی کی گرمی سے شمع کی طرح شاخ

بھی پگھل رہی ہے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ نازک نازک شاخیں پھولوں سے لدی ہوئی ہیں اور پھول کے بوجھ سے شاخیں جھک گئی ہیں اور دیکھنے میں چھوٹی لگ رہی ہیں جس کو شاعر نے شاخ کے پگھلنے سے تعبیر کیا ہے۔ نویں شعر میں موسمِ بہار کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا جارہا ہے کہ ہر ایک پھول پر پتیوں کا سایہ اس عمدگی سے پڑ رہا ہے جیسے (ساغرلعل) سرخ رنگ کی شراب میں (زمرد) سبز رنگ کو گھول کر ملا دیا گیا ہو۔یعنی اس شعر میں یہ کہا جارہا ہے کہ سرخ اور سبز رنگ ملانے سے جو رنگ بنتا ہے، وہی رنگ پھولوں پر پتیوں کا سایہ پڑنے کی وجہ سے ہوگیا ہے۔ دسویں شعر میں مبالغہ اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے مگر کمال یہ ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں نہیں گذرتا بلکہ قاری شاعر کے تخیل کی داد دینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔اس شعر میں موسمِ بہار کے فیض کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ (حنظل) جو ایک نہایت کڑوا پھل ہوتا ہے جسے اندرائن کا پھل بھی کہا جاتا ہے، اس میں بھی یہ خاصیت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر شہد کی مکھی ڈنک ماردے تو اس سے شہد ٹپکنے لگے۔

گیارہواں اور بارہواں شعر گریز کا ہے۔اس قصیدے میں تشبیب کے کل ۱۳۳ اشعار ہیں۔منتخب متن کے طور پر یہاں تشبیب کے دس اشعار ہی کی تشریح کی گئی ہے۔تشبیب کے بعد اس قصیدے میں گریز کی طرف رُخ کیا گیا ہے۔تقریباً چھے اشعار میں شاعری کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کے بعد اس کے سلسلے کو ممدوح کی صفات سے جوڑتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ شاعر کی شاعری میں تمام خوبیاں حضرت علیؓ کی مدح سرائی کی وجہ سے پائی جاتی ہیں جس کی ذات خدائی صفات سے روشن ومعمور ہے، جس کی محبت سے سورج کی مانند دل روشن ہوجاتا ہے اور جس سے نفرت کرنے والوں کا چہرہ زحل کی مانند سیاہ ہوجاتا ہے۔

گریز کے بعد مدح کے اشعار ہیں۔ شعر نمبر تیرہ سے شعر نمبر سولہ تک تمام اشعار آپس میں مربوط ہیں۔ان میں سوداؔ نے اپنے ممدوح (حضرت علیؓ) کی مدح کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرا ممدوح شیر خدا ہے، شہ مرداں (دلیروں کا تاجدار جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا لقب ہے) اور رتبے میں سب سے اعلیٰ ہے۔میرا ممدوح نبیؐ کا جانشیں ہے اور بارہ اماموں میں انھیں سب سے پہلا امام ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ممدوح کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے کہ اگر کوئی پیدائشی نابینا شخص حضرت علیؓ کی جوتیوں کی خاک کو سرمے کی طرح اپنی آنکھوں میں لگالے تو اس کی آنکھیں ایسی روشن ہوجائیں کہ وہ تمام پوشیدہ چیزیں اور مستقبل میں پیش آنے والی چیزوں کو دیکھ سکتا ہے۔آگے کہا گیا ہے کہ مدح غائب سے نہ تو تعریف کرنے والے کا دل بھرے گا اور نہ ممدوح کے رتبے سے انصاف کیا جاسکے گا۔اس لیے ممدوح کی تمام صفات کو ظاہر کرنے کے لیے مطلعِ ثانی کی ضرورت ہے۔ سترہویں شعر میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور حضرت علیؓ کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جو تیرا علم ہے، وہی خدا کا علم ہے اور جو تیرا عمل ہے، وہی خدا کا عمل ہے۔ دراصل جوشِ عقیدت کی وجہ سے ممدوح کی صفات کو خدا کی صفات کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔اٹھارہویں شعر میں مدح سرائی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر ممدوح کی رائے کے مطابق طبیب نسخہ نہ لکھے (یعنی مریض کا

علاج نہ کرے) تو پھر چاہے وہ حضرت عیسیٰ کا لکھا ہوا نسخہ اور علاج کیوں نہ ہو، اس سے مریض کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

انیس سے بائیس تک کے اشعار میں حضرت علیؓ کی تلوار کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کی تیغ دوسر (دو دھاری تلوار) کی صفات کو کہاں تک بیان کیا جائے۔ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ تلوار تجھ سے محبت کرنے والوں کے قلب کی صفائی کرتی ہے یعنی دیکھنے والوں کے دلوں کو روشن و منور کرتی ہے۔ چنانچہ میدان جنگ میں تلوار کے قبضے پر حضرت علیؓ کے دست مبارک کو دیکھ کر دنیا کا کوئی مذہب دین مصطفوی کے آگے ٹک نہیں سکتا۔ اگر حضرت علیؓ میدان جنگ میں اپنی تیغ دوسر (حضرت علیؓ کی ضرب کاری کی وجہ سے ان کی تلوار کو تیغ دوسر اور ذوالفقار کہا جاتا ہے) کو نیام سے باہر نکال کر دشمنوں پر حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھیں تو خوف و دہشت سے دشمنوں کا ہی نہیں بلکہ زمانے کی ثابت قدمی کا دم بھی نکل جائے۔ یعنی زمانہ استقلال کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ حضرت علیؓ کی تلوار کو کسی قسم کا ڈر اور خوف نہیں ہے۔ وہ تو موت کی تلوار ہے۔ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ممدوح کی تلوار نہ کبھی جھڑتی ہے، نہ کبھی مڑتی ہے اور نہ کبھی اس میں بل پڑتا ہے۔ تیئسویں اور چوبیسویں شعر میں حضرت علی کے گھوڑے کی برق رفتاری کا بیان ہے کہ اس کی تیزی کو دیکھ کر بے ساختہ منھ سے سبحان اللہ (خدا کی شان میں تعریفی کلمہ) نکلتا ہے۔ اگر توسن وہم (خیال کے گھوڑے) کو ممدوح حضرت علیؓ کے گھوڑے کے ساتھ دوڑایا جائے تو خیال پیچھے رہ جائے گا اور گھوڑا پہلے ہی قدم میں دنیا کا سفر کر کے واپس آ جائے گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے گھوڑے کی رفتار انسانی خیال سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں انتہائی مبالغے سے کام لیا گیا ہے اور مبالغہ قصیدے کے لیے عیب نہیں بلکہ اس کا حسن سمجھا جاتا ہے۔

پچیس سے ستائیس تک کے اشعار میں حضرت علیؓ کے عدل وانصاف کا ذکر ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کے انصاف کا خوف اتنا زیادہ ہے کہ جنگلوں میں شیر جیسا پھاڑ کھانے والا جانور بھی ہرن کے سر درد کے واسطے صندل کو گھس کر دوا تیار کر رہا ہے۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اگر بھیڑیے کی کھال کو ڈھولک میں منڈھوا کر بکری کے سامنے ڈھولک بجائی جائے تو خوف و دہشت کے مارے ڈھولک سے آواز نہ نکلے۔ یہاں شاعر نے نقصان پہنچانے والے جان دار اور بے جان چیزوں پر بھی اپنے ممدوح کے عدل وانصاف کا خوف دکھایا ہے۔ اس کے بعد والے شعر میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی پتھر شیشے کو نقصان پہنچانا چاہے تو غضب ناک ہو کر شیشے میں اتنی قوت پیدا ہو جائے کہ وہ پہاڑ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مسل کر (خردل) رائی کے دانے کی طرح بنا دے۔ آگے کے دو اشعار میں بھی حضرت علیؓ کے عدل وانصاف ہی کا بیان ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کے دور میں آسمان کا سنہرا پرندہ یعنی سورج کسی ستارے کو دانہ سمجھ کر نگل گیا ہے۔ اس شعر میں مرغ یعنی پرندے کی رعایت سے دانہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ مرغ زریں سورج کا استعارہ ہے۔ دراصل یہ فطری امر ہے کہ سورج کی تیز روشنی کے سامنے ستارے چھپ جاتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ پیدا کیا گیا ہے کہ آسمان کے سورج

نے ستاروں کو دانہ سمجھ کر چگ لیا ہے۔اس کی وضاحت دوسرے شعر میں اس طرح کی گئی ہے کہ سورج کے بال و پر کے تار تار ہونے سے مراد سورج کی کرنوں کا بکھرا ہوا ہونا ہے۔اس کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ممدوح کے عدل کی قوت کے باز نے اپنے پنجے سے اس کو مسل ڈالا ہے۔ یہاں تخیل کمال کا عمدہ مظاہرہ کرتے ہوئے سورج کی شعاعوں کے بکھرنے کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ سورج ستارے کو دانہ سمجھ کر نگل گیا۔اس لیے ممدوح کے انصاف نے سورج کو یہ سزا دی کہ اس کے گریباں کو چاک چاک کر دیا ہے۔تیس سے بتیس تک کے اشعار میں حضرت علیؓ کے علم خاص جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیا تھا، کی وضاحت کی گئی ہے۔روز ازل جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آسمان اور پہاڑ کو علم کا بوجھ سونپ دیا جائے تو آسمان و پہاڑوں نے بہانہ بنا دیا کہ اے خدا! ہم اتنا بھاری بوجھ نہیں اُٹھا سکتے ، ہم بہت کمزور ہیں۔آخر کار خدا نے جب یہ دیکھ لیا کہ حضرت علیؓ کے علاوہ کوئی اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکے گا تو علم کی ذمہ داری ان کو سونپ دی گئی۔

آگے کے اشعار حسن طلب کے ہیں۔تینتیس سے پینتیس تک اشعار میں شاعر نے اپنے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہا ہے کہ اے رب کائنات! میں نے آپ کے سامنے اپنے دل کا حال اور اپنی پریشانیاں بیان کر دیں۔یہ باتیں عرض کرنے کے بعد یہ تیرا (عبد اقل) حقیر بندہ چاہتا ہے کہ تو اسے آسمان کی اس مصیبت سے بچالے جس کا بیان اشعار میں گزر چکا ہے۔اس سے پہلے کہ اس کے جسم کے اجزا ہندوستان کی مٹی میں گل جائیں۔اے میرے مولیٰ! اس گنہگار بندے کی موت نجف کی سر زمین پر مقرر کر دے کیوں کہ جس شخص کو نجف کی پاک زمین پر موت آتی ہے، اس کو مرنے کے بعد بھی پاکیزہ زندگی یعنی جنت نصیب ہوتی ہے۔چھتیس سے اڑتیس تک کے اشعار میں شاعر نے کہا ہے کہ اس بات کو تسلیم کرنے میں مجھے کوئی حرج نہیں کہ میں تیرا غلام ہوں یعنی تیرا خدمت گزار ہوں۔تیرے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہی میری نجات کا سبب بنے گا۔میرے اس بیان پر آپ مجھے معاف بھی کر سکتے ہیں اور سزا بھی دے سکتے ہیں۔سب کچھ تیرے اختیار میں ہے و گرنہ انسان خدا کی تعزیر (سزا) سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔شاعر نے کہا ہے کہ میں نے اب تک جو بھی باتیں عرض کی ہیں، اس کا مقصد یہی ہے کہ میرا سر دولت مندوں کے آگے کبھی نہ جھکے۔آپ مجھے ایسی خوش حالی عطا فرمائیں کہ میں اہل دول (ثروت مندوں) کے سامنے کبھی ذلیل و خوار نہ ہوں۔اے مولیٰ! تو اپنے خزانے سے میری قسمت کے مطابق یتحلل (تحلیل ہونے والی چیزیں) میرے لیے مقرر کر دے یعنی میں اس دنیا میں چین و سکون کی زندگی گزار سکوں اور آرام سے کھا پی سکوں۔

انتالیس سے بیالیس تک کے اشعار دعا کے ہیں۔سوداؔ نے تشبیب اور مدح کے اشعار کی طرح اس قصیدے کا اختتام بھی نئے ڈھنگ سے کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس مدحیہ نظم کو دعائیہ پر اس طرح ختم کروں کہ تشبیب کے بعض مضامین بھی شامل ہو جائیں۔خدا سے دعا کی گئی ہے کہ اس دنیا کی بہار، رونق اور چمک دمک اسی طرح قائم و دائم رہے۔باغ میں پھولوں کی خوش بو ایسی ہو کہ بلبل مست ہو کر چہکتی رہے۔بادِ صبا

(صبح کو چلنے والی ہوا) غنچوں کی گرہوں کو اسی طرح کھولتی رہے یعنی کلی سے پھول بننے کا سفر یوں ہی جاری وساری رہے۔ خدا کرے جب تک اس قصیدے کا نام باب الجنت (جنت کا دروازہ) ہے تب تک اس نظم کی برکت سے میری امیدیں اور آرزوئیں پوری ہوتی رہیں۔ اس قصیدے کی برکت سے میری آخرت سنور جائے یعنی مجھے جنت نصیب ہو جائے۔ آخری شعر میں شاعر اپنے ممدوح سے محبت کرنے والوں کے حق میں دعا اور بغض رکھنے والوں کے حق میں بددعا کرتا ہے کہ جب تک دنیا کا وجود قائم ہے، تجھ سے محبت کرنے والے نخلِ امید (امید کا درخت) سے پھل پاتے رہیں یعنی میرے ممدوح سے محبت کرنے والوں کی تمام آرزوئیں پوری ہوتی رہیں اور جو میرے ممدوح سے محبت نہیں رکھتے، انھیں دنیا میں کبھی پھل نہ ملے یعنی ان کی امیدیں اور خواہشات کبھی پوری نہ ہوں۔

5.3.4 ماحصل

مرزا محمد رفیع سوؔدا اُردو کے عظیم قصیدہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۷۱۳ء میں دلی میں ہوئی۔ ان کو اگرچہ اُردو غزل میں کمال حاصل تھا لیکن انھیں اصل شہرت اور مقبولیت قصیدہ نگاری سے حاصل ہوئی۔ ان کے قصائد میں تشبیب سے لے کر دعا اور حسنِ طلب تک کے اشعار میں قصیدہ گوئی کے تمام فنی لوازمات پائے جاتے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں زبان کی شان وشوکت، بلند تخیل، مضمون آفرینی، جدتِ بیان اور مبالغہ آرائی جیسے تمام اوصاف موجود ہیں۔ ان کے قصیدوں میں روانی وبرجستگی کا یہ عالم ہے کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سوؔدا نے تشبیب، گریز، مدح، دعا اور حسن طلب میں اپنے تخیل کے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ بعد میں آنے والے قصیدہ نگاروں کی مشکلیں اور بڑھ گئیں۔ قصیدوں میں زبان کے خلاقانہ استعمال، شکوہِ الفاظ، بلند آہنگی، مشکل تراکیب اور نامانوس الفاظ کے استعمال کی وجہ سے اُردو قصیدہ نگاری کی روایت میں سوؔدا کو منفرد وممتاز مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اُردو قصیدے کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ انھیں اسباب کی بنا پر ان کو قصیدے کا نقاش اول اور فارسی قصیدہ گو شعرا جیسے خاقاؔنی، عرفؔی اور انورؔی کا ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے۔ 'باب الجنت در منقبت حضرت علیؑ' ان کا معرکتہ الآرا قصیدہ ہے جس میں ان کی جودتِ طبع اور کمالِ تخیل دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ قصیدہ شاعرانہ محاسن سے پُر ہے۔

5.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- مرزا محمد رفیع سوؔدا کے سوانحی احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- مرزا محمد رفیع سوؔدا کی قصیدہ نگاری سے بحث کی۔
- مرزا محمد رفیع سوؔدا کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے آگہی حاصل کی۔

- مرزا محمد رفیع سوداؔ کے قصیدہ 'باب الجنت در منقبت حضرت علیؓ کے منتخب اشعار کی قرأت کی۔
- مرزا محمد رفیع سوداؔ کے قصیدہ 'باب الجنت در منقبت حضرت علیؓ کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھا۔

5.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ سوداؔ کے سوانحی احوال وکوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ سوداؔ نے سب سے زیادہ کن قصیدہ نگاروں سے کسبِ فیض کیا ہے؟

۳۔ سوداؔ کے قصیدوں میں تشبیب کے موضوعات سے بحث کیجیے۔

۴۔ بہمن ودے سے کیا مراد ہے؟ شاملِ نصاب قصیدے کی تشبیب کا موضوع بتائیے۔

۵۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

مرغ زرین فلک ،عہد میں تیرے شاید　　بوجھ کر دانہ، گیا ہے کسی اختر کو نگل

تارتار اس کے جو یہ بال و پر آتے ہیں نظر　　باز قدرت نے ترے ،پنجے سے ڈالا ہے مسل

5.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ ۱۷۱۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے آبا واجداد بخارا سے ہندوستان تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ان کے والد مرزا محمد شفیع دہلی میں پیدا ہوئے جو پیشے سے ایک مشہور تاجر تھے۔ سوداؔ کی تعلیم وتربیت دہلی میں ہی ہوئی۔ان کا بچپن عیش وعشرت میں گزرا۔بچپن سے ہی ان کی طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل تھی۔لہٰذا انھوں نے اپنی پوری توجہ شعرگوئی کی طرف مرکوز کرلی اور وہ اپنا بیش تر وقت بسنت خان خواجہ سرا، احمد علی خان اور عماد الملک وغیرہ کی صحبت میں گزارنے لگے۔ان کا زیادہ تر وقت امرا اور رؤسا کی صحبت میں گزرتا تھا۔اس لیے طبیعت میں شان وشوکت اور رئیسانہ وضع داری پیدا ہوگئی۔انھوں نے شعرگوئی کا آغاز فارسی شاعری سے کیا۔فارسی شاعری میں ان کے استاد سراج الدین علی خان آرزوؔ تھے۔ خان آرزوؔ کے بعد انھوں نے سلیمان قلی خان داؔد اور پھر شاہ حاتمؔ کی شاگردی اختیار کی۔سوداؔ مہذب، شریف، خوش اخلاق، زندہ دل، یار باش اور انتہائی نازک مزاج تھے۔خلافِ طبع کوئی بات برداشت نہیں کرسکتے تھے۔اسی کے سبب سوداؔ کی اپنے معاصرین سے ادبی چشمک بھی رہی ہے اور انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کی ہجویں لکھی ہیں جن میں میر تقی میرؔ، میر غلام حسین ضاحکؔ، مرزا فاخر مکینؔ اور قیام الدین قائمؔ وغیرہ شامل ہیں۔ جب دلی میں حالات ناسازگار ہوگئے تو سوداؔ فرخ

آباد چلے آئے۔ پھر شجاع الدولہ کی دعوت پر فیض آباد گئے۔ بعد میں آصف الدولہ نے جب دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو سوداؔ نے بھی لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی اور لکھنؤ میں ہی ۲۷ جون ۱۷۸۱ء میں اُردو کے اس عظیم الشان شاعر کا انتقال ہوا جنھیں امام باڑہ باقر علی میں دفنایا گیا۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل)

۲۔ سوداؔ نے سب سے زیادہ فارسی قصیدہ نگاروں عرفیؔ، خاقانیؔ اور انوریؔ سے کسبِ فیض کیا ہے۔

۳۔ سوداؔ نے اپنے قصیدوں کی تشبیب میں موضوع کی مناسبت سے نئے نئے مضامین نظم کیے ہیں۔ ان کے قصیدوں کی تشبیب میں بہاریہ، نشاطیہ، فلسفیانہ، متصوفانہ، عاشقانہ، رندانہ اور حکیمانہ وغیرہ موضوعات ملتے ہیں۔

۴۔ بہمن گیارہواں اور دے دسواں مہینہ ہے۔ یہ ایرانی مہینوں کے نام ہیں۔ ان مہینوں میں موسمِ خزاں کا آغاز ہوتا ہے۔ شاملِ نصاب قصیدے کی تشبیب کا موضوع موسمِ بہار کا بیان اور اس کی مرقع کشی ہے۔ تشبیب کے اشعار میں موسمِ بہار کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ ان اشعار میں حضرت علیؓ کے عدل و انصاف کا بیان ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کے دور میں آسمان کا سنہرا پرندہ یعنی سورج کسی ستارے کو دانہ سمجھ کر نگل گیا ہے۔ اس شعر میں مرغ یعنی پرندے کی رعایت سے دانہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ مرغ زریں سورج کا استعارہ ہے۔ دراصل یہ فطری امر ہے کہ سورج کی تیز روشنی کے سامنے ستارے چھپ جاتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ پیدا کیا گیا ہے کہ آسمان کے سورج نے ستاروں کو دانہ سمجھ کر چگ لیا ہے۔ اس کی وضاحت دوسرے شعر میں اس طرح کی گئی ہے کہ سورج کے بال و پر کے تار تار ہونے سے مراد سورج کی کرنوں کا بکھرا ہوا ہونا ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ممدوح کے عدل کی قوت کے باز نے اپنے پنجے سے اس کو مسل ڈالا ہے۔ یہاں تخیل کمال کا عمدہ مظاہرہ کرتے ہوئے سورج کی شعاعوں کے بکھرنے کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ سورج ستارے کو دانہ سمجھ کر نگل گیا۔ اس لیے ممدوح کے انصاف نے سورج کو یہ سزا دی کہ اس کے گریباں کو چاک چاک کر دیا ہے۔

5.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
بہمن و دے	:	دے دسویں اور بہمن گیارہویں ایرانی مہینوں کے نام
تیغِ اُردی	:	اُردی ایرانیوں کے سال (شمسی) بہار کا دوسرا مہینہ، بہار کی تلوار

مستاصل	:	جڑ سے اکھڑ نا
عزوجل	:	جو غالب اور عظیم ہو (خدا تعالیٰ کی صفت کے طور پر مستعمل)
قوتِ نامیہ	:	اُگنے اور بڑھنے کی قوت
نباتات	:	وہ چیزیں جو زمین سے اُگتی ہیں، پھل، سبزی، پودے وغیرہ
خلعت	:	لباس، پوشاک
آب جو	:	نہر
گل نو رستہ	:	نئے نئے کھلے ہوئے پھول، تازہ پھول
پوشش	:	لباس، غلاف
دشت وجبل	:	جنگل اور پہاڑ
تگرگ	:	آسمان سے برف کی شکل میں گرنے والے اولے
بے کل	:	بے چین، بے قرار
سایۂ برگ	:	پھولوں کا سایہ
حنظل	:	کڑوا پھل، اندرائن کا پھل
زنبور	:	شہد کی مکھی
عسل	:	شہد
زحل	:	ایک سیارہ جو منحوس خیال کیا جاتا ہے
نعلین	:	جوتیاں
عقدہ	:	گرہ، گتھی
کسل	:	سستی، کاہلی، کمزوری
تیغ دوسر	:	وہ تلوار جس کے دونوں طرف دھار ہو
مِلل	:	ملت کی جمع، ملتیں، قومیں، مذاہب

فرس	:	گھوڑا
اچل	:	اپنی جگہ سے نہ چلنے والا، غیر متحرک
آہو	:	ہرن
گرگ	:	بھیڑیا
پوست	:	چمڑا، کھال
دہل	:	ڈھولک
عرائض	:	عرضیاں، درخواستیں
باب الجنت	:	جنت کا دروازہ
امل	:	امید، آرزو
برومند	:	پھل لانے والا، بار آور، کام یاب
نخلِ اُمید	:	اُمید کا درخت
وضع	:	شکل، رنگ ڈھنگ، طریقہ
دست بردار	:	چھوڑنے والا، باز آنے والا
مراسم	:	میل جول، رسمیں

5.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اُردو میں قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ابو محمد سحر

۲۔ اُردو قصیدہ نگاری (مرتبہ) : ڈاکٹر اُمِّ ہانی اشرف

۳۔ اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ : ڈاکٹر محمود الٰہی

۴۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ : ڈاکٹر خلیق انجم

۵۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ (مونوگراف) : پروفیسر قاضی افضال حسین

اردو کے نمائندہ قصیدہ نگار اور متن کی تدریس و تفہیم	۶۔	سودا	:	شیخ چاند
	۷۔	صنفیات	:	پروفیسر قاضی افضال حسین

اکائی 6 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم
(زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر)

ساخت

6.1 اغراض و مقاصد

6.2 تمہید

6.3 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

6.3.1 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سوانحی احوال و کوائف

6.3.2 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی قصیدہ نگاری

6.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

6.3.4 ماحصل

6.4 آپ نے کیا سیکھا؟

6.5 اپنا امتحان خود لیجیے

6.6 سوالوں کے جوابات

6.7 فرہنگ

6.8 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے۔
- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی قصیدہ نگاری سے بحث کریں گے۔
- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔

- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے قصیدہ ’در مدح بہادر شاہ ظفر‘ کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے۔
- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے قصیدہ ’در مدح بہادر شاہ ظفر‘ کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھیں گے۔

6.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ اُردو کے عظیم قصیدہ نگار مرزا محمد رفیع سوداؔ کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے واقف ہوئے۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز قصیدہ نگار شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے، ان کی قصیدہ نگاری سے بحث کریں گے اور ان کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے، ساتھ ہی ان کے مشہور قصیدہ ’در مدح بہادر شاہ ظفر‘ کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح کو سمجھیں گے۔

6.3 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

6.3.1 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سوانحی احوال و کوائف

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی ولادت ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء میں ہوئی۔ والد شیخ محمد رمضان شاہ پور ضلع مظفر نگر سے منتقل ہو کر دہلی آئے۔ دہلی میں وہ نواب لطف علی خاں کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ شیخ محمد رمضان غیر تعلیم یافتہ انسان ہونے کے باوجود فہم و فراست کے مالک تھے۔ بزرگانِ دین، اسلاف کے واقعات اور اہلِ علم و فضل کے کمالات ان کی یادداشت میں محفوظ تھے جس سے مستفیض ہو کر ان کی شخصیت کو چار چاند لگ گئے۔ محمد حسین آزادؔ نے ذوقؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ ’’آپ کا رنگ سانولا تھا۔ چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے نو دفعہ چیچک نکلی تھی مگر رنگت اور داغ کچھ ایسے مناسب اور موزوں واقع تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے‘‘۔ ذوقؔ کی ابتدائی تعلیم محلّہ کابلی دروازہ کے ایک مکتب میں ہوئی۔ مولوی عبدالرازق اور حافظ غلام رسول شوق سے کسبِ فیض کیا۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ہی شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ حالاں کہ ان کی تعلیم رسمی طریقے پر نہ ہو سکی مگر ذاتی ذوق و شوق کی بنا پر انھوں نے اپنے تعلیمی سلسلے کو قائم رکھا اور اپنے زمانے کے مروجہ علوم و فنون سے بہ خوبی اور کما حقہ واقفیت حاصل کر لی۔ قدیم شعرا کا کلام ہمہ وقت ان کے مطالعے میں رہتا تھا۔ اس کے سبب ان کے شعور میں پختگی پیدا ہوئی اور شاعری کی نزاکتوں میں انھیں مہارت حاصل ہوئی۔ بقول محمد حسین آزادؔ ’صدہا شعر اُن کو زبانی یاد تھے‘‘۔ ذوقؔ ۱۹ برس کی عمر میں شہزادہ ولی عہد مرزا ابوظفر کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ دربار تک رسائی میں ان کے گہرے دوست میر کاظم حسین نے اہم کردار ادا کیا۔ ابوظفر اپنی غزلوں کی اصلاح شاہ نصیرؔ سے لیتے تھے۔ شاہ نصیرؔ شاعری میں خود ذوقؔ کے بھی استاد تھے۔ بعد میں ذوقؔ سے ابوظفر اصلاح لینے لگے۔ ذوقؔ نے کم

عمری میں ہی استنادِ سخن حاصل کرلیا اور وہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ یہ مشاعرے دہلی کے علمی و ادبی حلقوں کی جان ہوا کرتے تھے اور ان مشاعروں میں ہر کس و ناکس کلام پیش کرنے کی جرأت بھی نہ کرسکتا تھا۔ ذوقؔ نے ان مشاعروں میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی اور ولی عہد ابوظفر کے علاوہ اس وقت کے بہت سے شعرا نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ ذوقؔ کو دلی اس قدر راس آئی کہ وہ کبھی دہلی سے باہر نہیں گئے اور ہمیشہ بہادر شاہ ظفؔر کے دربار سے وابستہ رہے۔ ذوقؔ نے اپنی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھایا اور وہ بہادر شاہ ظفؔر کے دربار کے ملک الشعرا بنائے گئے۔ ملک الشعرا بنائے جانے سے قبل اکبر شاہ ثانی کے عہد میں وہ خاقانیِ ہند کے خطاب سے نوازے گئے تھے اور یہ خطاب ان کی شخصیت اور عظمت کا جزو بن کر قائم رہا۔ اس وقت ذوقؔ کی عمر محض ۱۹ برس تھی۔ اکبر شاہ کی مدح میں انھوں نے شان دار قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع تھا:

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو نمائے گلشن

اسی قصیدہ پر ذوقؔ کو شاہی دربار سے خاقانیِ ہند کا خطاب ملا تھا۔ ذوقؔ خوش گلو اور بلند آواز تھے۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ علمِ نجوم، رمل، طب، تاریخ اور تصوف میں انھیں کافی دخل تھا۔ بزرگانِ دین سے خاص عقیدت تھی۔ اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ مزاج میں خودداری اور استغنا ہونے کے علاوہ طبیعت میں تیزی بھی تھی۔ ذوقؔ کا عہد شعری اعتبار سے مالا مال تھا کہ اس عہد میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ اساتذہ فن جیسے مومنؔ، غالبؔ، ناسخؔ، آتشؔ اور وزیرؔ موجود تھے۔ ذوقؔ کے شاگردوں میں داغؔ اور محمد حسین آزادؔ جیسے شعرا بہت معروف ہوئے۔ ذوقؔ کا انتقال ۶۸ سال کی عمر میں ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ کو ہوا۔ وفات سے تھوڑی دیر پہلے یہ شعر ان کی زبان پر تھا:

کہتے ہیں ذوقؔ آج جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

6.3.2 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی قصیدہ نگاری

ذوقؔ قصیدہ اور غزل دونوں کے بلند پایہ شاعر تھے۔ گوکہ غالبؔ اور مومنؔ غزل میں ذوقؔ سے اعلیٰ مقام رکھتے ہیں مگر ذوقؔ کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ ان کا غزلیہ کلام مختصر مگر فنی اعتبار سے پختہ اور عمدہ ہے۔ دہلی کے روزمرہ اور محاورے کے لیے تو ان کا کلام سند تصور کیا جاتا تھا۔ انھوں نے طویل سے طویل تر غزلیں بھی لکھیں اور مشکل اور سنگلاخ زمینوں کو بھی اختیار کیا۔ ان کی بعض غزلیں ۱۵۰ اشعار پر بھی مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں خارجی عناصر اور داخلی احساسات کا ایک حسین امتزاج بھی موجود ہے۔ یہی ان کی انفرادیت ہے جو ان کو شاہ نصیرؔ اور ناسخؔ جیسے شعرا سے مختلف اور ممتاز بناتی ہے۔ اس ضمن میں خواجہ الطاف حسین حالؔی کے درج ذیل اقتباس کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ رقم طراز ہیں:

''کوئی شاعر جس نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا، وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا۔ خود مرزا غالبؔ کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا، اس کو شعرا میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ اس بنا پر وہ ذوقؔ کو پورا شاعر اور شاہ نصیرؔ کو ادھورا شاعر جانتے تھے۔''

(خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مقدمۂ شعروشاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، ص:۱۲۴)

'قصائدِ ذوق' مرتبہ شاہ محمد سلیمان کے مطابق ذوقؔ کے قصیدوں کی کل تعداد تیس جب کہ 'انتخابِ کلامِ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ' مرتبہ تنویر احمد علوی کے مطابق ان کے مطبوعہ قصائد کی تعداد ۲۵ ہے۔ حالاں کہ محمد حسین آزادؔ کا یہ خیال ہے کہ ''اگر جمع ہوتے تو خاقانی ہند کے قصائد خاقانیِ شروانی سے دوچند ہوتے''۔ ذوقؔ کے بعض قصائد ناتمام رہے تو بعض نظرِ ثانی سے محروم رہ گئے۔ ذوقؔ نے حمد، نعت اور منقبت میں کوئی مکمل قصیدہ تحریر نہیں کیا۔ صرف ایک قصیدہ ایک بزرگ سید عاشق نہال چشتی کی مدح میں کہا ہے۔ بقیہ ان کے تمام قصیدے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں ہیں۔ ذوقؔ کے ابتدائی دور کے قصائد میں تکلف، تصنع اور آورد کی کمی نظر آتی ہے اور ایک نوع کا فطری پن، شگفتگی، جوش اور روانی جیسے اوصاف ان کے ابتدائی قصائد میں موجود ہیں۔ جب شاہ نصیرؔ سے ان کی ادبی معرکہ آرائی شروع ہوئی تو قوتِ کمال اور ملکۂ سخن کے اظہار کے سبب ان کے قصیدوں میں مشکل پسندی اور صنّاعی درآئی اور ان کے قصیدوں کی تمہید وتشبیب میں علمی اصطلاحات کی کثرت، صنائع وبدائع کے استعمال، معارفانہ اور حکیمانہ خیالات اور مدح میں مبالغہ آرائی، بلندی تخیل اور معنی آفرینی نے جگہ بنائی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آخری دور کے قصائد میں ایک خاص قسم کی پختگی، سنجیدگی اور جوش نمایاں ہے جس کا جیتا جاگتا ثبوت ان کا شاہ کار قصیدہ 'شب کو اپنے سر بستر خواب راحت' ہے۔ اس قصیدہ کو اُردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس قصیدہ میں اٹھارہ مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات جیسے فنِ طب، موسیقی، رقص، خطاطی، رمل، نجوم، ہیئت، منطق، فلسفہ، ریاضی، تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ شامل ہیں۔

ذوقؔ نے جہاں اپنے قصائد میں شگفتہ اور رواں زمینوں کا انتخاب کیا، وہیں سنگلاخ زمینوں میں بھی انھوں نے قصیدے کہے۔ انھوں نے ترنم اور روانی کا بھی خاص خیال رکھا، طویل اور مترنم بحروں کا انتخاب کیا، مرصع ترکیبوں اور برابر کے ٹکڑوں سے شعریت پیدا کی۔ انھوں نے اگرچہ جدت سے کام نہ لیا مگر صناعی کو ملحوظ رکھا۔ اکثر قصائد میں انھوں نے بہاریہ، رندانہ اور نشاطیہ تشبیہیں لکھیں جن میں مبالغہ، تخیل اور محاکات کا دامن تھامے رکھا۔ اس کے علاوہ ان کی تشبیبوں میں زمانہ اور گردشِ روزگار کی شکایت، اجرامِ فلکی کا تذکرہ اور علم وفن کی ناقدری جیسے نئے مضامین بھی پیش کیے گئے۔ بعض قصائد میں حکیمانہ اور اخلاقی مضامین بھی بڑی ہنرمندی سے نظم کیے گئے ہیں۔ تشبیب میں کئی موضوعات پر طبع آزمائی کرکے اسے نیا رنگ دینے میں ذوقؔ کو امتیاز حاصل ہے۔

تشبیب کے یہ اشعار دیکھیے:

نظر خلق سے چھپ سکتے نہیں اہل صفا
تہہ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر

(حکیمانہ مضمون)

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی

(بہاریہ و رندانہ مضمون)

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر

(نشاطیہ)

گریز میں بھی ذوقؔ نے بڑی برجستگی دکھائی ہے۔ سوداؔ کی طرح بعض قصائد میں انھوں نے مکالمے کے ذریعے گریز کی ہے اور اختصار سے بھی کام لیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض قصائد میں انھوں نے گریز کا خاص اہتمام نہیں کیا ہے اور غیر مربوط انداز میں تشبیب کے بعد وہ مدح کی طرف آ گئے ہیں۔ البتہ مدح میں ذوقؔ نے اپنے جوہر اور تیور خوب دکھائے ہیں۔ زورِ کمال اور پُر شکوہ الفاظ و تراکیب سے ایک سماں باندھ دیا ہے۔ مبالغہ اور تخیل سے مدح کا درجہ اپنے کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ وہ اپنے ممدوح کے عہدے، مرتبے، اوصافِ حمیدہ، شجاعت، عدالت، مروت اور اخلاق کی تعریف بڑے زور و شور اور جوش کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ بادشاہ جس کا بہادر شہ اسم پاک
ہے درج زمانہ کا یکتا درخوش آب

ظل اللہ خسرودیں دار، دیں پناہ
شاہ بلند جاہ و خدیوِ فلک جناب

ذوقؔ ممدوح کے اوصافِ حمیدہ کے علاوہ اس کے ساز و سامان، اس کی سواری جیسے گھوڑے، ہاتھی اور اس کے آلاتِ حرب جیسے تلوار، نیزے اور تیر وغیرہ کا ذکر بھی بڑی عمدگی اور ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر وہ نئے انداز اور پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نئی نئی تشبیہات و استعارات سے موضوع اور بیان کو ممتاز اور منفرد بنا دیتے ہیں۔ ان کے الگ الگ قصیدوں سے ہاتھی کی تعریف میں یہ دو اشعار دیکھیے:

کوہ البرز کو سائے میں دبا لے اپنے

ہے وہ اے شاہ فلک رتبہ تری رفعت فیل
کہ فیل کوہ کجک تیشہ فیل باں فریاد
وہ دونوں دانت صفا ایک ایک جوئے شیر

مجموعی اعتبار سے ذوقؔ کے قصائد اعلیٰ معیار کے ہیں گو کہ سوداؔ کے مقابلے ان کے یہاں تصنع اور آورد کا دخل زیادہ ہے مگر نازک خیالی، علمیت اور سنجیدگی کے لحاظ سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ذوقؔ کے قصائد کی فضا بھی کسی حد تک محدود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاہی دربار سے مستقلاً وابستہ رہے اور ان کی نظر بھی درباری ماحول تک محدود ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے تمام قصیدے بڑے اہتمام اور محنت سے تحریر کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر قصیدے کا اپنا الگ رنگ ہے اور اس میں جدتِ خیال اور معنی آفرینی پیدا کی گئی ہے۔ اعجاز حسین نے ذوقؔ کی قصیدہ نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''قصیدہ گوئی میں ذوقؔ کا پایہ بہت بلند ہے۔ سوداؔ کے بعد اس صنفِ شاعری کے معیار کو قائم رکھنے میں انھوں نے بڑی قابلیت سے کام لیا۔ مضامین میں تنوع اور بیان میں زورِ علمیت خاص طور پر نمایاں ہے۔ الفاظ کا نادر اور دل کش ذخیرہ خوبی سے یکجا کرتے ہیں۔ ترنم کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ تشبیب میں عموماً ندرت اور پُرکاری سے کام لیتے ہیں۔ مختلف مسائل پر بحث بھی کرتے جاتے ہیں۔ باوجود سنگلاخ زمین و الفاظ کے ذہن میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہوتی مگر بلند تخیل کی کمی، جامعیت ذوقؔ کو سوداؔ کے برابر نہیں پہنچنے دیتی۔''
>
> (ڈاکٹر سید اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اُردو، ادارۂ فروغ اُردو، لکھنؤ، ۱۹۶۵ء، ص: ۱۴۲)

6.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

(قصیدہ در مدحِ بہادر شاہ ظفر: منتخب اشعار)

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو خامے سے تحریرِ نغمہ جاے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑیے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آوازِ خوش تر از بم و زیر

کرے ہے وا لبِ غنچہ در ہزار سخن
چمن میں موجِ تبسم کی کھول کر زنجیر

کچھ انبساطِ ہوائے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیلِ مست بے زنجیر

ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دودِ گلخن بھی
برستا اٹھتا ہے آتش سے مثلِ ابر مطیر

ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغرِ عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر

چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پر جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطّہ کشمیر

نہ کیوں کہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع
کہ آئے ہے نظر اک قدرتِ خدائے قدیر

ظہور نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیم و نکہتِ گل مظہرِ لطیف و خبیر

جہاتِ ستّہ سے بزمِ جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجومِ نشاط و سرورِ جمِّ غفیر

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہِ عیش و نشاط
کہ شمسِ بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر

زمینِ مے کدہ یہ خندۂ نشاط انگیز
کہ لائے مے سے ہو دیوارِ قہقہہ تعمیر

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے
ضمیرِ خلق سے اے بادشاہِ پاک ضمیر

شہنشہا! ترے یُمنِ شفائے کامل سے

جو لاعلاج مرض تھے وہ ہیں علاج پذیر
بدل گئی ہے حلاوت سے تلخیِ دارو
شرابِ تلخ بھی ہے مے کشوں کو شکر و شیر
قوی ہے قوتِ تاثیر سے دوائے طبیب
غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر
رہا نہ کوئی گرفتارِ رنج عالم میں
چھٹے جو تیرے تصدّق میں مجرمانِ اسیر
شہا! ہے دم سے ترے زندگانیِ عالم
یہ تیرا دم ہے وہ اعجازِ عیسوی تاثیر
تو وہ ہے حامیِ دنیا و دیں زمانے میں
کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر
کیا شہانِ سلف نے مسخّر ایک جہاں
کیے ہیں تو نے شہنشاہ! دو جہاں تسخیر
پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلعِ روشن
کہ جس کا مطلعِ خورشید بھی نہ ہووے نظیر
شہنشہا! وہ تری روشنیِ رائے منیر
عقولِ عشرہ کے انوار جس کے عُشرِ عَشیر
جو ہیں نکات و معانی بشر کی فہم سے دور
وہ تیرے ذہن میں موجود سب قلیل و کثیر
مجال کیا کہ ترے عہد میں شرر کی طرح
اٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشانِ شریر
ترے نسق سے جو بالکل رہی نہ خوں ریزی
لڑائیوں میں کہیں پھوٹتی نہیں نکسیر
وہ برقِ قہر خدا، تیری تیغِ آتش دم
کہ جس کی آنچ ترے دشمنوں کو نارِ سعیر

جو ہے خدنگ کا تیرے نشانہ چشم حسود
تو ہے تفنگ کا تیرے دل عدو نخچیر

ترا سمند ہے وہ تیز رو کہ وقتِ خرام
نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی نہ اس کی نظیر

کہ سیرگاہ ہے اُس کی تو راہِ یک روزہ
اور اس کا شرق سے تا غرب عرصہ گاہِ مسیر

ترے جو فیل کی تعریف خسروا لکھوں
کروں حکایتِ شیریں و کوہ کن تحریر

کہ فیل کوہ، کجک تیشہ ، فیل باں فرہاد
وہ دونوں دانت صفا ایک ایک جوے شیر

جہاں مسخّر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مویّد و اختر معین و بخت نصیر

نہ ہے ثنا کے لیے تیرے اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لیے تیری انتہا و اخیر

مگر یہ ذوقؔ ثناسنج و مدح خواں تیرا
غلامِ پیرِکہن سال، اک فقیرِ حقیر

کرے ہے دل سے دعا، یہ سدا فقیرانہ
سنا ہے جب سے کہ رحمِ خدا، دعاے فقیر

الٰہی آب پہ ہوتا زمیں، زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک، اور فلک کو ہو تدویر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامنِ مسیح حیات
زمیں پہ خضر کی تا ہو فنانہ دامن گیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادرِ قیوم
بجاہ و دولت و اقبال و عزّت و توقیر

تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمر طویل

سپاہِ وافر و ملکِ وسیع و گنجِ خطیر

عزیز طلبا! ابھی آپ نے ذوقؔ کے معروف قصیدہ 'قصیدہ در مدحِ بہادر شاہ ظفر' کے جن منتخب اشعار کی قرأت کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

یہ قصیدہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی صحت یابی کی خوشی کے موقع پر پیش کیا گیا تھا اور جس وقت یہ پیش کیا گیا، بہار کا موسم تھا۔ اس لیے اس قصیدے کی تشبیب میں نشاط و مسرّت اور باغ و بہار دونوں کے تلازمے جمع کر دیے گئے ہیں۔ پہلے اور دوسرے شعر میں خوشی کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس خوشی کا کیا کہوں کیوں کہ یہ ایسی خوشی ہے کہ اگر اسے لکھا جائے تو قلم سے سرسراہٹ کی آواز کے بجائے نغمے کے سُر ظاہر ہونے لگیں یعنی قلم بھی نغمہ ریز ہو جائے اور خوشی کا حصّہ بن جائے۔ پہلے شعر میں تحریر کا لفظ دو بار لایا گیا ہے اور دونوں جگہ معنی الگ الگ ہیں۔ اسے صنعتِ تجنیس تام کہتے ہیں۔ خامہ، تحریر اور صریر میں بھی ایہامِ تناسب موجود ہے۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ یہ ایسی خوشی ہے کہ اگر اس کا تذکرہ زبان سے چھیڑ دیا جائے تو سانس کے تار سے ایک ایسی آواز ظاہر ہونے لگے جو کسی نغمے کے زیر و بم سے زیادہ اچھی ہو یعنی سانس کی آمد و رفت سے ایسی آواز پیدا ہو جو ایک خوب صورت نغمہ کی مانند ہو۔

تیسرے سے لے کر دسویں تک کے اشعار میں موسمِ بہار کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس موسمِ بہار میں چمن میں کلی کے ہونٹ موجِ تبسم کی زنجیر کھول کر ہزار ہزار باتوں کا دروازہ کھول رہے ہیں۔ ہر کلی مسکرا مسکرا کر محوِ گفتگو ہے۔ یہاں ایک جانب غنچہ، چمن اور تبسم میں اور دوسری جانب تکلم، لب اور سخن میں مراعاۃ النظیر ہے۔ آگے کہا جا رہا ہے کہ چمن کی ہوا میں فرحت و انبساط کی ایسی کیفیت پائی جاتی ہے کہ اگر تصویر میں بنی ہوئی بلبل کی چونچ کسی کلی کی طرح کھل اٹھے تو یہ بات باعثِ تعجب نہیں ہے یعنی ایسا ہونا ممکن ہے کیوں کہ ہوا کے ذریعے چمن میں بے پناہ خوشی اور مسرت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ آسمان پر چھائے ہوئے کالے بادلوں کا منظر ہے۔ کالا بادل آسمان پر اس طرح دوڑتا ہوا جا رہا ہے جیسے کوئی مست ہاتھی زنجیر کے بغیر بھاگتا جا رہا ہو یعنی بہت تیز رفتاری کے ساتھ جس میں ایک طرح کی دھمک بھی ہوتی ہے۔ ہوا کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں ایسی تری اور شگفتگی یعنی تازگی اور شادابی پائی جاتی ہے کہ بھٹّی سے اٹھنے والا دھواں بھی جب آگ سے اوپر اٹھتا ہے تو بارش برسانے والے بادل کی طرح برستا ہوا اٹھتا ہے۔ ماحول کچھ ایسا ہے کہ موسمِ بہار کے اثر سے ہر کانٹا پھول میں تبدیل ہو گیا ہے اور ہر پھول عیش و عشرت اور خوشی و فرحت کا ایک جام بن گیا ہے۔ اس طرح ہر ایک صحرا ایک ایسے خوب صورت چمن میں تبدیل ہو گیا ہے کہ گویا ہر چمن بہشت کی مثال بن گیا ہے۔ اس موسمِ بہار میں چمن کے اندر سبز درختوں پر ایسی رونق اور شادابی پائی جاتی ہے اور سبز درخت اس قدر ہرے بھرے ہیں کہ اسے دیکھ کر خطۂ کشمیر کے ہرے بھرے درخت بھی اس طرح رشک و حسد کرتے ہیں کہ گویا زہر کھانے پر آمادہ ہیں یعنی چمن اس موسم میں بے حد سرسبز و شاداب ہے اور ایک خوب صورت منظر پیش کرتا ہے۔ زہر اور سبزہ کے درمیان یہ مناسبت ہے کہ زہر کا رنگ بھی سبز ہوتا

ہے۔ گلشن یا چمن کے منظر کو دیکھ کر شاعر کے دل میں ایک مطلع پیش کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کیوں کہ اسے چمن میں ہر طرف خدائے قدیر کی قدرت کے جلوے نظر آرہے ہیں یعنی چمن میں موجود سبزہ، پھول، پودے، درخت، طیور غرض تمام چیزیں بے حد خوب صورت اور حسین ہیں۔ ان میں خدا کی قدرت نظر آتی ہے۔ چنانچہ شاعر مطلعِ ثانی کہتا ہے جس میں چمن کی چار چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی چار صفات بیان کی گئی ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ چمن میں نرگس اور گلاب کے پھول دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ سمیع و بصیر کا جلوہ پیش کررہے ہیں۔ اس طرح پھول کے پاس سے گذرنے والی صبح کی ہوا اور اس کی خوش بو میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ لطیف وخبیر کی صفت نمایاں ہورہی ہے۔

گیارہویں سے تیرہویں تک کے اشعار میں نشاط وسرور اور مسرت وشادمانی کی کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ دنیا کی انجمن اپنی چھے کی چھے جہتوں میں وسعت کی خواہش مند ہے یعنی وہ ہر طرف سے پھیل جانا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں نشاط کا ہجوم اور خوشی کی بھاری بھیڑ جمع ہوگئی ہے۔ دنیا میں ہر طرف خوشی کا عالم چھایا ہوا ہے جس کے اثر سے مدرسہ بھی عیش ونشاط کی ایسی انجمن بن گیا ہے کہ اب وہاں شمس بازغہ کے بجائے بدرِ منیر پڑھنے کا سلسلہ جاری ہوگیا ہے۔ یعنی فلسفہ جیسی خشک کتاب کے بجائے وہاں دل چسپ اور رومانی معاشقے کی کتاب پڑھی جاتی ہے۔ (شمسِ بازغہ، فلسفے کی کتاب ہے)۔ کہا جارہا ہے کہ عیش ونشاط کے ہجوم کا یہ حال ہے کہ مے کدہ کی زمین میں خوشی لانے والی ہنسی کی ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کوئی چاہے تو شراب کی تلچھٹ سے دیوار قہقہہ تعمیر کرسکتا ہے۔ اس شعر میں تلمیح ہے۔

چودہویں سے اٹھارہویں تک کے اشعار میں بادشاہ کے غسلِ صحت اور اس کے اثر کا بیان کیا جارہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اے پاک باطن بادشاہ! آپ کے غسلِ صحت نے عام لوگوں کے باطن سے رنج کو دھو دیا ہے یعنی آپ کی صحت یابی کی وجہ سے سارے عوام اپنے رنج وغم کو بھول گئے ہیں اور ہر جگہ خوشی کا ایک ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ دھونے، غسل اور پاک میں رعایت ہے۔ آگے کہا جارہا ہے کہ اے ہمارے عظیم بادشاہ! دنیا میں جس قدر لاعلاج بیماریاں سر اٹھائی ہوئی تھیں، وہ سب آپ کی مکمل شفا کی برکت سے علاج کو قبول کرنے والی بن گئی ہیں، ان کا علاج ڈھونڈ لیا گیا ہے یعنی اب وہ ختم ہوجائیں گی۔ اے بادشاہ! آپ کی صحت یابی کی ایک تاثیر یہ بھی ہے کہ دواؤں کی تلخی مٹھاس میں بدل گئی ہے یعنی کڑوی دوائیں میٹھی بن گئی ہیں۔ اسی طرح شراب پینے والوں کے لیے کڑوی شراب شکر ملے ہوئے دودھ کی طرح ہوگئی ہے یعنی مضر اثرات صحت عطا کرنے والے اثرات میں تبدیل ہورہے ہیں۔ اے بادشاہ! آپ کی صحت یابی کی برکت کی وجہ سے طبیب کی دوا میں ایسی قوتِ تاثیر آگئی ہے کہ وہ ہر مرض کو قوت کے ساتھ دبادیتی ہے۔ اسی طرح فقیر کی دعا قبولیت کی دولت سے مالا مال ہوگئی ہے یعنی اس کی ہر دعا قبول ہوجاتی ہے۔ شاعر نے یہاں کمال کا نکتہ پیش کیا ہے کہ ڈاکٹر کی دوا میں بادشاہ کی صحت یابی کی برکت کے سبب قوت تاثیر درآئی ہے جس سے ہر مریض صحت یاب ہوجاتا ہے۔ اب اس دنیا کا یہ حال ہے کہ یہاں

کوئی رنج و غم میں گرفتار نہیں رہا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے مجرم قیدی تھے، وہ سب کے سب آپ کی صحت یابی کے صدقے میں آزاد کر دیے گئے۔

انیس سے چھبیس تک کے اشعار بادشاہ کی مدح میں ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ اے بادشاہ! آپ ہی کے وجود سے دنیا کی زندگی قائم ہے یعنی آپ کے ہونے سے زندگی میں رمق اور دمک رہتی ہے۔اس لیے یہ کہنا بھی درست ہے کہ آپ کے دم میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کی تاثیر پائی جاتی ہے جو اپنی پھونک سے مُردوں کو بھی زندہ کر دیا کرتے تھے۔اے بادشاہ! آپ اس زمانے میں دین و دنیا کے ایسے محافظ ہیں جس سے دنیا کو زینت اور دین کو عزت حاصل ہے یعنی آپ کے ذریعے عوام کا دین بھی محفوظ ہے اور اس کی دنیا بھی سلامت ہے۔اگلے بادشاہ جو دنیا سے گزر چکے ہیں، انھوں نے صرف ایک دنیا پر حکومت کی تھی لیکن اے شہنشاہ! آپ نے دونوں دنیا کو اپنے بس میں کر لیا ہے یعنی آپ نے دونوں عالم پر قابو پا لیا ہے۔مبالغہ کی صفت سے معمور یہ شعر بادشاہ کی سلطنت کی توسیع اور اس کے استحکام کی وضاحت کرتا ہے۔اگلے شعر میں شاعر کی جانب سے کہا جا رہا ہے کہ اے بادشاہ! میں آپ کی تعریف میں ایک ایسا روشن مطلع پڑھنا چاہتا ہوں جس کی طرح آفتاب کے طلوع کا منظر بھی نہیں ہو سکتا۔یعنی یہ مطلع سورج کی چمک سے بھی زیادہ منور، روشن، عیاں اور ظاہر ہے۔شاعر نے نہایت عمدگی سے اس مضمون کو پیش کیا ہے کہ جس طرح کائنات کے متحرک ہونے کا آغاز سورج کے نکلنے سے ہوتا ہے بالکل اسی طرح وہ اس مطلع سے بادشاہ کی تعریف کو روشن اور واضح کرنا چاہتا ہے۔آگے کہا جا رہا ہے کہ اے بادشاہ! آپ کی روشن رائے میں ایسی روشنی پائی جاتی ہے کہ جس کے مقابل میں عقول عشرہ کی روشنیاں مل کر بھی سوواں حصہ ہو پاتی ہیں۔یعنی آپ کی رائے سب سے زیادہ بہتر اور مناسب و موزوں ہوتی ہے۔چوں کہ مبالغہ قصیدہ کے لیے شرط ہے۔لہٰذا شاعر یہاں مبالغے سے کام لیتا ہے اور بادشاہ کی عقل کو سب سے زیادہ بہتر تصور کرتا ہے۔آگے کہا جا رہا ہے کہ اے بادشاہ! آپ کا ذہن ایسا اعلیٰ درجے کا ہے کہ وہ نکتے اور معانی جو عام انسانوں کی سمجھ سے دُور رہیں، وہ آپ کے ذہن میں سب کے سب قلیل ہوں یا کثیر، ہر وقت موجود رہتے ہیں۔شاعر یہاں بادشاہ کی فہم و بصیرت اور اعلیٰ ذہن کی تعریف کرتا ہے کہ ہر طرح کے نکات اور معانی کی تہہ تک بادشاہ کا اعلیٰ دماغ پہنچ جاتا ہے۔آگے کہا جا رہا ہے کہ اے بادشاہ! آپ کے رعب و دبدبے کا یہ عالم ہے کہ باغیوں کی مجال نہیں کہ وہ آپ کے عہدِ سلطنت میں سرکشی کریں، بغاوت کریں اور شرارت کے طور پر شعلے کی طرح اپنا سر اٹھائیں۔ یہ شعر بادشاہ کے بہترین منتظم اور منصرم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ بادشاہ اس قدر بہترین منتظم، طاقت ور اور زبردست ہے کہ ان کی وجہ سے ہر طرف امن و امان قائم ہے۔ ان کے عہدِ سلطنت میں ملک کا انتظام اتنا عمدہ ہے کہ اب کہیں کسی طرح کی خوں ریزی نہیں ہوتی یہاں تک کہ لڑائیوں میں کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹتی یعنی ہر طرف امن قائم ہے اور چین وسکون کا عالم ہے۔ ذرہ برابر بھی کہیں کسی قسم کا انتشار اور بدامنی نہیں ہے۔ بادشاہ کا نظم و نسق اس قدر بہتر اور زبردست ہے کہ کسی کی کسی سے لڑائی تک کی نوبت نہیں آتی۔

ستائیسواں شعر بادشاہ کی تلوار کی تعریف میں ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اے بادشاہ! آپ کی تلوار جو آگ جیسی تاثیر رکھنے والی ہے، وہ درحقیقت قہرِ خداوندی کی بجلی ہے۔ وہ تلوار جس پر گرتی ہے، اسے فنا کردیتی ہے اور اس سے نکلنے والی آنچ بادشاہ کے دشمنوں کے حق میں جہنّم کی آگ کے مشابہ ہے۔ یعنی بادشاہ کی تلوار سے بچنا ممکن نہیں ہے اور ان کے دشمن کی آخرت اور دنیا دونوں تباہ ہے۔ اٹھائیسواں شعر بادشاہ کے تیر اور ان کی بندوق کی تعریف میں ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اے بادشاہ! آپ کا تیر حسد کرنے والوں کی آنکھ کو اپنا نشانہ بنالیتا ہے اور آپ کی بندوق دشمن کے دل کو شکار کرلیتی ہے یعنی کوئی بھی بدنگاہ اور بدخواہ آپ سے بچ نہیں سکتا۔

انتیس سے تیس تک کے دو اشعار میں بادشاہ کے گھوڑے کی تعریف کی گئی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اے بادشاہ! آپ کا گھوڑا ایسا تیز رفتار ہے کہ جب وہ دوڑنے لگے تو زرقا کی نگاہ بھی اس کی نظیر نہیں بن سکتی کیوں کہ دیدۂ زرقا کی سیرگاہ تو ایک دن کی مسافت کا راستہ ہے اور اس گھوڑے کی سیر کا میدان مشرق سے لے کر مغرب تک ہے۔ آگے کے اشعار میں کہا جارہا ہے کہ اے بادشاہ! اگر میں آپ کے ہاتھی کی تعریف لکھنا چاہوں تو مجھے شیریں و فرہاد کی کہانی تحریر کرنی ہوگی یعنی میں یہ کہوں گا کہ آپ کا ہاتھی مثل پہاڑ کے ہے اور اس کا آنکُس فرہاد کے تیشے (کلہاڑی) کی مانند ہے اور اس کا فیل بان فرہاد جیسا ہے اور اس کے دونوں شفاف دانت جوئے شیر (دودھ کی نہر) کی مانند ہیں۔ تینتیسویں شعر میں کہا جارہا ہے کہ بادشاہ سلامت! یہ دنیا آپ کے قابو میں کردی گئی ہے۔ اس طرح وہ آپ کی اطاعت گذار اور فرماں بردار بن گئی ہے اور تمام مخلوق آپ کے زیرِ فرمان ہیں اور آپ کی سرپرستی میں ہیں۔ آسمان آپ کی تائید کرنے والا ہے اور قسمت کا ستارہ آپ کا معاون اور قسمت آپ کی مددگار ہے۔ چونتیسواں شعر مدح کا خاتمہ اور دعا کے آغاز کی تمہید ہے۔ اس لیے کہا جارہا ہے کہ بادشاہ سلامت! آپ کی تعریف کے لیے کوئی اختتام یا خاتمہ نہیں ہے یعنی ہم جس قدر بھی تعریف کریں، وہ کم ہی ہے۔ اسی طرح آپ کے لیے جتنی بھی دعا کی جائے، اس دعا کی کوئی انتہا اور حد نہیں ہے یعنی ہم دعا کریں بھی تو ہم سے حق ادا نہیں ہوسکتا۔ آگے کے دو اشعار دعا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایک طرف مدح کے خاتمے کی جانب اشارہ ہے اور دوسری طرف دعا کے آغاز کی تمہید ہے۔ ان اشعار میں شاعر اپنے ممدوح یعنی بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگرچہ نہ تو ثنا کا حق مجھ سے ادا ہوا اور نہ دعا اپنے حقوق کے ساتھ کامل انداز میں کی جاسکی۔ پھر بھی ذوقؔ جو آپ کی تعریف کرنے والا، مدح خوانی کرنے والا ہے اور آپ کا ایک بوڑھا غلام ہے، جو فقیرِ حقیر کی حیثیت رکھتا ہے، جب سے اس نے یہ سن لیا ہے کہ فقیر کی دعا رحمتِ خداوندی کا ذریعہ بنتی ہے، وہ ہمیشہ فقیروں کے انداز میں آپ کے لیے دل سے دعا کرتا رہتا ہے۔

آگے کے اشعار دعا کے ہیں۔ پہلے کے دو شعر میں دوام کے مضمون کو پیش کیا گیا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اے پروردگار! قدرت رکھنے والی اور کائنات کو باقی رکھنے والی ذات! یہ زمین جب تک پانی پر قائم ہے، جب تک زمین کو ٹھہراؤ نصیب ہے، جب تک زمین کے اوپر آسمان ہے، آسمان کو جب تک گولائی حاصل ہے، جب تک

زندگی آسمان پر حضرت عیسیٰ کا دامن نہیں چھوڑتی، جب تک موت زمین پر حضرت خضر علیہ السلام کا دامن نہیں پکڑتی یعنی جب تک حضرت عیسیٰ آسمان پر زندہ ہیں اور جب تک حضرت خضر زمین پر موجود ہیں یعنی قیامت تک بادشاہ کو عزت و وقار کے ساتھ طاقت ور بدن، صحیح مزاج، لمبی عمر، مرتبے، سلطنت، اقبال وعروج، بھاری بھرکم لشکر، وسیع سلطنت اور بے انتہا خزانہ عطا فرما۔

6.3.4 ماحصل

ذوقؔ اُردو کے ممتاز قصیدہ نگار ہیں۔ انھوں نے کئی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی نمایاں شناخت قصیدہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ اُردو قصیدہ نگاری میں سوداؔ کے بعد ذوقؔ کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ ان کے قصائد میں قصیدے کے فنی لوازم موجود ہیں۔ ان کے موجودہ دیوان میں تیس سے زائد قصیدے ہیں جو علمی اصطلاحات سے پُر ہیں۔ ان کے تمام قصائد علمیت اور معنی آفرینی کی عمدہ مثال قرار دیے جاسکتے ہیں جن میں مبالغہ آرائی، بلندی تخیل، محاکات، حسنِ تعلیل، تلمیح، تمثیل، تشبیہ واستعارہ، ضرب الامثال، فارسی الفاظ وتراکیب، علمی وادبی اصطلاحات، احادیث اور آیات کے حصّے، عربی محاورے اور فقرے، مبالغہ اور بحروں کا ترنم، غرض سب کچھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوداؔ کی تقلید کرتے ہوئے بھی ذوقؔ کے قصائد ایک نئے رنگ میں نظر آتے ہیں۔ ہم بجا طور پر ان کے قصائد کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ اُردو قصیدہ نگاری میں ان کے قصائد انفرادیت کی شان لیے ہوئے ہیں جن میں بیان کی ندرت، زبان کی صفائی، علمی متانت وسنجیدگی، اعلیٰ ذوق اور فنی رموز سے گہری واقفیت موجود ہے۔ ان کا قصیدہ 'قصیدہ در مدحِ بہادر شاہ ظفر' شاہکار قصیدہ ہے جس کے مطالعے سے فن قصیدہ نگاری پر ان کی کامل مہارت کا احساس ہوتا ہے۔

6.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سوانحی احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی قصیدہ نگاری سے بحث کی۔
- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے قصیدہ 'در مدح بہادر شاہ ظفر' کے منتخب اشعار کی قرأت کی۔
- شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے قصیدہ 'در مدح بہادر شاہ ظفر' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھا۔

6.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سوانحی احوال وکوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے قصیدوں کی تعداد بتائیے۔

۳۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے قصائد کی خوبیوں سے بحث کیجیے۔

۴۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اپنے ممدوح کی تعریف میں کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟

۵۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

الٰہی آب پہ ہوتا زمیں، زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک، اور فلک کو ہو تدویر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامنِ مسیح حیات
زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا نہ دامن گیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادرِ قیوم
بجاہ و دولت و اقبال و عزّت و توقیر

تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمر طویل
سپاہِ وافر و ملکِ وسیع و گنجِ خطیر

6.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی ولادت ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء میں ہوئی۔ والد شیخ محمد رمضان شاہ پور ضلع مظفر نگر سے منتقل ہو کر دہلی آئے۔ دہلی میں وہ نواب لطف علی خاں کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ ذوقؔ کی ابتدائی تعلیم محلّہ کابلی دروازہ کے ایک مکتب میں ہوئی۔ مولوی عبدالرازق اور حافظ غلام رسول شوق سے کسبِ فیض کیا۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ہی شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ حالاں کہ ان کی تعلیم رسمی طریقے پر نہ ہو سکی مگر ذاتی ذوق وشوق کی بنا پر انھوں نے اپنے تعلیمی سلسلے کو قائم رکھا اور اپنے زمانے کے مروجہ علوم وفنون سے بہ خوبی اور کماحقہ واقفیت حاصل کر لی۔ قدیم شعرا کا کلام ہمہ وقت ان کے مطالعے میں رہتا تھا۔ اس کے سبب ان کے شعور میں پختگی پیدا ہوئی اور شاعری کی نزاکتوں میں انھیں مہارت حاصل ہوئی۔ ذوقؔ ۱۹ ر برس کی عمر میں شہزادہ ولی عہد مرزا ابوظفر کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ ذوقؔ نے کم عمری میں ہی استنادِ سخن حاصل کر لیا اور وہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ ان مشاعروں میں

ذوقؔ نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی اور ولی عہد ابوظفر کے علاوہ اس وقت کے بہت سے شعرا نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ ذوقؔ نے اپنی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھایا اور وہ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار کے ملک الشعرا بنائے گئے۔ ملک الشعرا بنائے جانے سے قبل اکبر شاہ ثانی کے عہد میں وہ خاقانیِ ہند کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر محض ۱۹ر برس تھی۔ ذوقؔ خوش گلو اور بلند آواز تھے۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ علمِ نجوم، رمل، طب، تاریخ اور تصوف میں انھیں کافی دخل تھا۔ بزرگانِ دین سے خاص عقیدت تھی۔ اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ مزاج میں خودداری اور استغنا ہونے کے علاوہ طبیعت میں تیزی بھی تھی۔ ذوقؔ کے شاگردوں میں داغؔ اور محمد حسین آزادؔ جیسے شعرا بہت معروف ہوئے۔ ذوقؔ کا انتقال ۶۸ سال کی عمر میں ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ کو ہوا۔

۲۔ 'قصائد ذوق' مرتبہ شاہ محمد سلیمان کے مطابق شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے قصیدوں کی کل تعداد تیس جب کہ 'انتخاب کلام شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ' مرتبہ تنویر احمد علوی کے مطابق ان کے مطبوعہ قصائد کی تعداد ۲۵ ہے۔

۳۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے تمام قصائد میں مضمون آفرینی، مبالغہ آرائی، محاکات، حسنِ تعلیل، تلمیح، تمثیل، تشبیہ و استعارہ، ضرب الامثال، فارسی الفاظ و تراکیب، علمی و ادبی اصطلاحات، احادیث اور آیات کے حصّے، عربی محاورے اور فقرے، مبالغہ اور بحروں کا ترنم، غرض سب کچھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوداؔ کی تقلید کرتے ہوئے بھی ذوقؔ کے قصائد ایک نئے رنگ میں نظر آتے ہیں۔ ہم بجا طور پر ان کے قصائد کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ اُردو قصیدہ نگاری میں ان کے قصائد انفرادیت کی شان لیے ہوئے ہیں جن میں بیان کی ندرت، زبان کی صفائی، علمی متانت و سنجیدگی، اعلیٰ ذوق اور فنی رموز سے گہری واقفیت موجود ہے۔

۴۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ ممدوح کی تعریف میں اس کے اوصافِ حمیدہ کے علاوہ اس کے ساز و سامان، اس کی سواری جیسے گھوڑے، ہاتھی، اس کے آلاتِ حرب جیسے تلوار، نیزے اور تیر وغیرہ کا ذکر بھی بڑی عمدگی اور ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر وہ نئے انداز اور پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نئی نئی تشبیہات و استعارات سے موضوع اور بیان کو ممتاز اور منفرد بنا دیتے ہیں۔

۵۔ یہ اشعار دعا کے ہیں۔ پہلے کے دو شعر میں دوام کے مضمون کو پیش کیا گیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اے پروردگار! قدرت رکھنے والی اور کائنات کو باقی رکھنے والی ذات! یہ زمین جب تک پانی پر قائم ہے، جب تک زمین کو ٹھہراؤ نصیب ہے، جب تک زمین کے اوپر آسمان ہے، آسمان کو جب تک گولائی حاصل ہے، جب تک زندگی آسمان پر حضرت عیسیٰ کا دامن نہیں چھوڑتی، جب تک موت زمین پر حضرت خضر علیہ السلام کا دامن نہیں پکڑتی یعنی جب تک حضرت عیسیٰ آسمان پر زندہ ہیں اور جب تک حضرت خضر

زمین پر موجود ہیں یعنی قیامت تک بادشاہ کو عزت ووقار کے ساتھ طاقت ور بدن، صحیح مزاج، لمبی عمر، مرتبے، سلطنت، اقبال وعروج، بھاری بھرکم لشکر، وسیع سلطنت اور بے انتہا خزانہ عطا فرما۔

6.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
زہے	:	واہ واہ، کلمۂ تحسین وستائش
صریر	:	کاغذ پر قلم سے لکھنے کی سرسراہٹ کی آواز
تحریرِ نغمہ	:	راگ کی آواز
خامہ	:	قلم
پیدا ہونا	:	ظاہر ہونا
زیروبم	:	آواز کا اُتار چڑھاؤ
وا کرنا	:	کھولنا
لبِ غنچہ	:	غنچے کا لب
انبساط	:	پھیلنا، شگفتہ ہونا مراد خوشی
وا ہونا	:	کھل جانا
منقار	:	چونچ
پیل	:	ہاتھی
گلخن	:	بھٹی
ابرِ مطیر	:	بارش برسانے والا بادل
سبز	:	حسین، خوب رو، ہرا رنگ
زہر کھانا	:	جلنا، حسد کرنا
جوبن	:	حسن، رونق، بہار، جوانی
نسیم	:	پھولوں کے پاس سے گذرنے والی ہلکی ہوا
سبو	:	مٹکا، صراحی
چوبِ گل	:	پھولوں کی چھڑی
بیدِ مجنوں	:	بید کے درخت کی ایک قسم جس کی شاخیں آشفتہ، نازک اور جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ آشفتگی اور افسردگی کی وجہ سے اس کا نام بید مجنوں پڑا
عقولِ عشرہ	:	وہ دس فرشتے جن کو یونانی فلسفیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تخلیق

کائنات سے پہلے پیدا فرمایا تھا

شرر	:	شعلہ
تیغ آتش دام	:	آگ کی پھونک جیسی تاثیر رکھنے والی تلوار
سعیر	:	جہنّم
خدنگ	:	وہ درخت جس کی لکڑی سے تیر بنایا جاتا تھا مراد تیر
تفنگ	:	بندوق
نخچیر	:	وہ جانور جو شکار کر لیا جائے
سَمَند	:	تیز رفتار گھوڑا
خرام	:	چلنا، دوڑنا
زرقا	:	عرب کی وہ عورت جو ایک دن کی مسافت کی دوری کو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتی تھی
عرصہ گاہِ مسیر	:	سیر کا میدان، جانا، چلنا، سفر کرنا
ثنا سنج	:	بہت سوچ سمجھ کر تعریف کرنے والا

6.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ انتخاب کلام شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ (مرتبہ) : ڈاکٹر تنویر احمد علوی

۲۔ اُردو میں قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ابو محمد سحر

۳۔ دیوانِ ذوقؔ : منیرؔ لکھنوی

۴۔ قصیدہ کا فن اور اُردو قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین

۵۔ اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ : ڈاکٹر محمود الٰہی

اکائی 7 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار)

ساخت

7.1 اغراض و مقاصد

7.2 تمہید

7.3 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

7.3.1 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے سوانحی احوال و کوائف

7.3.2 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی قصیدہ نگاری

7.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

7.3.4 ماحصل

7.4 آپ نے کیا سیکھا؟

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

7.6 سوالوں کے جوابات

7.7 فرہنگ

7.8 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مرزا غالبؔ کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے۔
- مرزا غالبؔ کی قصیدہ نگاری سے بحث کریں گے۔
- مرزا غالبؔ کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- مرزا غالبؔ کے قصیدہ بعنوان 'قصۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے۔
- مرزا غالبؔ کے قصیدہ بعنوان 'قصۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھیں گے۔

7.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائیوں میں آپ مرزا محمد رفیع سوداؔ اور شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کی قصیدہ نگاری کی فنی خصوصیات و امتیازات سے واقف ہوئے۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے بلند پایہ شاعر مرزا غالبؔ کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے، ان کی قصیدہ نگاری سے بحث کریں گے اور اس کے فنی محاسن سے آگاہ ہوں گے، ساتھ ہی ان کے قصیدہ بعنوان 'قصۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح کو سمجھیں گے۔

7.3 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

7.3.1 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے سوانحی احوال و کوائف

مرزا غالبؔ کا خاندان ترکوں کے قبیلے ایبک سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی ولادت ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں ہوئی۔ دادا کا نام قوقان بیگ خاں، والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ پانچ برس کی عمر میں شفقت پدری سے محروم ہونے کے بعد چچا نصراللہ بیگ کے زیرِ کفالت آئے لیکن زیادہ عرصہ نہ ہوا کہ وہ بھی ہاتھی سے گرے اور اس چوٹ نے ان کی جان لے لی۔ اس وقت مرزا غالبؔ کی عمر آٹھ سے نو برس کے درمیان تھی۔ چچا کی وفات کے بعد مرزا غالبؔ اپنی ماں کے ساتھ ننھیال میں رہے۔ نانا رئیس شہر میں شمار ہوتے تھے۔ اس لیے مرزا غالبؔ کسی بھی فکر سے آزاد رہے اور کھیل کود اور تفریح میں انھوں نے اپنا زیادہ وقت گزارا۔ آگرے کے ہندو اور مسلمان رئیسوں کی صحبت انھیں حاصل رہی۔ مزاج میں لااُبالی پن اور شراب نوشی جیسی لت وہیں سے لگی تھی۔ مرزا غالبؔ کی تعلیم کے سلسلے میں بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ان کے چچا نے گھر پر ہی ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کر دیا تھا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم کے لیے استاد مقرر کیے گئے۔ آگرہ کے مشہور استاد شیخ معظم سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ فارسی ادبیات اور دیگر علوم کی تعلیم کے سلسلے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ مرزا غالبؔ نے باضابطہ کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ البتہ اتنی بات سچ ہے کہ غالبؔ کی شخصیت اور سیرت کے اولین نقوش شہر آگرہ میں تشکیل پائے۔ آگرہ میں ان کی زندگی کا زیادہ عرصہ جس محلے میں گزرا، فارسی زبان کے ماہرین اس محلے کے باشندے تھے۔ مثنوی مولانا رومؔ کے شارح مولانا ولی محمد اور نظامیؔ کے 'سکندر نامہ' کے مترجم میر اعظم علی اعظم یہیں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے۔ محلے کے علمی ماحول نے غالبؔ کو علم کا گرویدہ بنا دیا۔ مرزا غالبؔ کی شادی محض تیرہ برس کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں ہوئی۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم ان کی شریکِ حیات بنیں۔ اس وقت امراؤ بیگم کی عمر گیارہ سال تھی۔ نواب معروف خاں کا شمار دہلی کے شرفا میں ہوتا تھا۔ شاید سسرال میں گھر داماد کے طور پر قیام پذیر ہونے کے سبب مرزا غالبؔ کو اس عرف میں مرزا نوشہ کہا گیا۔ غالبؔ اور امراؤ بیگم کے یہاں سات اولادیں پیدا ہوئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی پندرہ مہینے سے زیادہ باحیات نہ رہی۔ مرزا غالبؔ نے امراؤ بیگم کے بھانجے میرزا زین العابدین خاں عارف کو

اپنا بیٹا بنالیا۔اس سے مرزا غالبؔ بے انتہا محبت کرتے تھے۔اس کی اچانک وفات سے مرزا غالبؔ کو بہت صدمہ پہنچا۔اس کی وفات کے بعد اس کے ایک بیٹے حسین علی خاں کو مرزا غالبؔ نے گود لے لیا۔کچھ عرصہ بعد عارف کے دوسرے بیٹے باقر علی خاں بھی وہیں آ گئے۔غالبؔ اور ان کی اہلیہ ان بچوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔مرزا غالبؔ سات برس کی عمر سے ہی دہلی آتے جاتے رہے۔شادی کے کچھ سال بعد انھوں نے مستقل طور پر دلّی میں سکونت اختیار کر لی۔محققین کے مطابق بلی ماران کی گلی قاسم جان یا پھاٹک حبش خاں کے محلے یا پھر اس کے قرب وجوار میں وہ رہائش پذیر رہے اور ہمیشہ کرائے پر رہے۔کچھ وقت میاں کالے صاحب کے مکان پر بغیر کرایے کے بھی انھوں نے زندگی گزاری۔مرزا غالبؔ کا بچپن ننھیال میں لطف ومسرت کے ساتھ گذرا لیکن شادی کے کچھ سال بعد پوری زندگی وہ دہلی میں رہے اور غدر سے پہلے اور اس کے بعد مختلف قسم کے ناسازگار حالات سے دوچار ہوئے۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے بچپن میں ہی شاعری شروع کر دی تھی اور فنِ شعر گوئی میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ان کا کمالِ فن ہی انھیں قلعے تک لے گیا جہاں انھوں نے ذوقؔ کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ کے کلام پر اصلاح بھی دی اور شہزادے کو پڑھایا بھی۔مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے شاعری کے علاوہ اُردو وفارسی میں متعدد تصنیفی و تالیفی کارنامے انجام دیے۔دہلی میں غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کو دیر سے تسلیم کیا گیا۔مدح گوئی کے صلے میں وہ خلعت وانعام سے نوازے گئے۔۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ ظفرؔ نے انھیں خاندان تیموریہ کی تاریخ قلم بند کرنے کی ذمہ داری سونپی جس کے لیے پچاس روپے ماہانہ معاوضہ مقرر کیا گیا۔ساتھ ہی ساتھ خلعت کے علاوہ نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ جیسے خطابات سے ان کی عزت افزائی بھی کی گئی۔زندگی کے آخری دس برسوں میں غالبؔ کو نواب رام پور کی جانب سے سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔اسی طرح نواب واجد علی شاہ نے مدح گوئی کے صلے میں سلطنت اودھ سے غالبؔ کے لیے پانچ سو روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا لیکن نواب واجد علی شاہ کی سلطنت دو برس بعد ہی ختم ہو گئی۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ لڑکپن میں مردانہ حسن وجمال کی بہترین مثال تھے۔وہ نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ہمیشہ پر تعیش زندگی کے لیے کوشاں رہے۔کہیں بھی جاتے تو سواری میں جاتے۔اچھا کھانا پسند کرتے۔آم اور انگور انھیں بہت مرغوب تھے۔غالبؔ کو مالی تنگی کا سامنا ضرور رہا اور وہ مقروض بھی رہے لیکن فیاضی ان کی صفت خاص رہی۔دوستوں کا خیال رکھنا انھیں پسند تھا۔انسان دوستی کا پہلو ان کی شخصیت وفکر میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔آزاد خیالی اور وسیع الذہنی ان کا خاصہ تھی۔اسی لیے ان کے مذہبی عقائد کا معاملہ بھی پے چیدہ رہا۔آبا واجداد سنی تھے لیکن خود کو ایک رُباعی میں انھوں نے صوفی مشرب قرار دیا ہے اور علی کا غلام اور بندۂ اثنا عشری بھی بتایا ہے۔مرزا غالبؔ کی زندگی کا بیش تر حصہ مالی پریشانیوں میں گھرا رہا۔آخر عمر میں انھیں مختلف قسم کے امراض نے آ گھیرا۔یہ معلوم نہیں کہ کس مرض کے سبب ان کا انتقال ہوا۔البتہ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ ذیابیطس کے مرض

کا شکار ہو گئے تھے۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں اس عظیم شاعر کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ دہلی دروازے کے باہر ان کی نماز جنازہ ہوئی اور حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے قریب ایک احاطے میں ان کی تدفین ہوئی۔

7.3.2 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی قصیدہ نگاری

مرزا غالبؔ نے اُردو قصیدہ نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی بلکہ وہ فارسی میں قصیدے لکھتے رہے۔ ان کے فارسی کلیات میں متعدد قصیدے شامل ہیں جن میں ایک قصیدہ اپنی تعریف میں، دو نعتیہ قصیدے، دس منقبتی قصائد، ایک اکبر شاہ ثانی کی مدح میں، پندرہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں، تین ملکۂ وکٹوریہ کی تعریف میں، سترہ دیگر انگریز حکام کی شان میں، سات سرکار اودھ کی مدح میں، گیارہ قصائد دیگر عمائدین کی تعریف میں اور ایک قصیدہ ضیاءالدین نیر کی شان میں موجود ہے۔ غالبؔ نے اُردو میں زیادہ قصیدے نہیں کہے ہیں۔ ان کے منتخب اُردو دیوان میں صرف چار مختصر قصیدے ہیں۔ ان میں دو قصیدے حضرت علیؓ کی منقبت میں ہیں اور دو قصیدوں میں بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق غالبؔ کے اُردو قصیدوں کی کل تعداد نو ہے لیکن غالبؔ نے بعض قصائد کو منسوخ کر دیا تھا۔ اس لیے بنیادی طور پر غالبؔ کے چار ہی قصیدے ہیں۔ بلاشبہ کمیت کے اعتبار سے غالبؔ کے قصیدے کم ہیں تاہم ان کا انفرادی انداز ان قصیدوں کو اہم مقام عطا کرتا ہے اور اسی سبب غالبؔ کو سوداؔ، ذوقؔ اور مومنؔ جیسے نمائندہ قصیدہ گو شعرا کی صف میں شامل کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ضیا احمد بدایونی نے انھیں قصیدے کے ایوان کے چار ستونوں (سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ) میں ایک اہم ستون قرار دیا ہے جن کو کسی بنیاد پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے غالبؔ کی قصیدہ گوئی کے محرکات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اہلِ بیت سے عشق وعقیدت کو ایک خاص دائرے میں ان کے محرکاتِ فن میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ سلاطین وامرا کی ہم نشینی کی آرزو، سرکار و دربار تک رسائی اور ان کی داد و دہش سے بہرہ یاب ہونے کی خواہش قصیدہ نگاری کے وہ تاریخی محرکات ہیں جو مرزا اور دوسرے قصیدہ نگاروں کے یہاں قدر مشترک کا درجہ رکھتے ہیں۔''
>
> (ڈاکٹر تنویر احمد علوی، غالبؔ کی فارسی شاعری: تعارف وتنقید، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۳)

مرزا غالبؔ انفرادیت پسند طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے اوروں سے جدا راستہ اختیار کیا اور اپنا خاص رنگ ایجاد کیا۔ اُردو شاعری میں ان کی امتیازی شناخت کا احساس ہوتا ہے اور یہ خاصیت ان کی

قصیدہ نگاری میں بھی نظر آتی ہے۔قصیدے میں بھی غالبؔ کی نمایاں ترین خصوصیت ان کی جدت طرازی ہے۔ انھوں نے قصیدہ گوئی میں بھی اپنی انفرادیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔اپنے قصیدوں میں انھوں نے قصیدے کے تمام اجزائے ترکیبی کوملحوظ رکھتے ہوئے اپنی فن کارانہ صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں اورتشبیب ،گریز، مدح اور دعا کوبحسن وخوبی برتنے کی کوشش کی ہے البتہ ان کی زیادہ توجہ اورفن کاری تشبیب اور گریز کے ضمن میں نظر آتی ہے۔مرزا غالبؔ کے اگرچہ چار ہی اُردو قصیدے دستیاب ہیں لیکن ان میں اعلیٰ مضامین،فکر وخیال کی رفعت و ندرت،پُرشکوہ الفاظ، جوشِ بیان کی موجودگی اورفنِ قصیدہ نگاری پر ان کی دسترس کے سبب انھیں ذوقؔ کے بعد اُردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں منفرد مقام حاصل ہے اور ادبی تاریخ کے صفحات میں ایک اہم موڑ کے طور پر ان کی قصیدہ نگاری کا ذکر کیا جاتا ہے۔مرزا غالبؔ کے ان چاروں قصیدوں کے مطلعوں سے فنِ قصیدہ نگاری پر ان کی فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کا پہلا قصیدہ ہے:

ساز یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار
سایۂ لالۂ بے داغ، سویدائے بہار

یہ قصیدہ اس اکائی میں شامل ہے جس پر آئندہ صفحات میں گفتگو ہوگی۔ان کا دوسرا قصیدہ ہے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

مولانا غلام رسول مہر کے مطابق یہ منقبت اٹھتر (۷۸) اشعار پر مشتمل تھی اور اس کا عنوان تھا 'قصیدہ فی منقبت' لیکن دیوان میں صرف تینتیس (۳۳) اشعار ہیں۔اس قصیدے کی تشبیب متصوفانہ ہے جس میں فلسفۂ وحدت الوجود پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مرزا غالبؔ کے مذکورہ دونوں قصیدوں کی زبان اور اسلوب پر فارسی اثرات حاوی ہیں اور ان میں فارسی الفاظ وتراکیب کا بہ کثرت استعمال ملتا ہے۔ان قصیدوں کا انداز اور اسلوب انتہائی فلسفیانہ اور فکر انگیز ہے۔ان کا تیسرا قصیدہ ہے:

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

یہ قصیدہ 'مدحِ شاہ' کے نام سے دیوان غالبؔ میں شامل ہے جس میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔یہ غالبؔ کا سب سے طویل قصیدہ ہے جس میں کل اٹھاون (۵۸) اشعار ہیں۔اس قصیدے کی تشبیب مکالماتی انداز کی ہے جس میں شاعر نے ماہِ نو یا ہلالِ عید سے کلام کرتے ہوئے انتہائی دل چسپ اور ڈرامائی سماں باندھنے کی کوشش کی ہے جس سے غالبؔ کی تخلیقی ہنرمندی اور تخئیلی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔بتیس (۳۲) شعروں کی یہ تشبیب اپنے آپ میں فن کاری کی عمدہ مثال ہے۔یہ قصیدہ اس دور کی یادگار ہے جب غالبؔ طرز بیدلؔ میں ریختہ گوئی کو قیامت کہہ کر سادہ گوئی کی طرف مائل ہوگئے تھے۔یہ پورا قصیدہ سادہ بیانی، برجستگی

اور بے ساختگی کی عمدہ مثال ہے۔ غالبؔ کا چوتھا قصیدہ ہے:

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

یہ قصیدہ بھی 'مدحِ شاہ' کے نام سے دیوان غالبؔ میں شامل ہے اور بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے میں کل تینتالیس (۴۳) اشعار ہیں۔ اس قصیدے کی تشبیب بھی بڑی دل آویز ہے۔ خوب صورت الفاظ، دل کش تراکیب اور عمدہ تشبیہات نے قصیدے کے لیے انتہائی دل چسپ فضا خلق کی ہے۔ اس تشبیب میں روانی و تسلسل کمال کا ہے۔ ماہرین نے اس قصیدے کی تشبیب کے اشعار کو زورِ بیان کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیا ہے جہاں غالبؔ نے لفظی صناعی کا بھرپور استعمال کیا ہے لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ پڑھنے والا ان اشعار کی روانی و برجستگی میں یہ احساس تک نہیں کرتا کہ یہاں کثرت سے شعری صنعتیں ہیں۔ غالبؔ کا یہ مشہور شعر اسی قصیدے کا ہے:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

مرزا غالبؔ اپنے قصیدوں کی تشبیب پر ناز کرتے تھے جس کا اظہار ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ حالیؔ کے مطابق تشبیب میں غالبؔ خود کو عرفیؔ اور انوریؔ کے ہم پلہ تصور کیا کرتے تھے۔ پروفیسر محمود الٰہی نے غالبؔ کے ہر قصیدے کی تشبیب کو 'تیرِ نیم کش' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی ہر تشبیب میں ندرتِ خیال بھی ہے اور ندرتِ ادا بھی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں جو قصیدہ انھوں نے مہ نو سے خطاب کرتے ہوئے تحریر کیا ہے، اس کی تشبیب کی بیش تر ناقدینِ فن نے تعریف کی ہے۔ دراصل اس تشبیب میں فنی پختگی کے ساتھ غالبؔ کی انفرادیت بھی جھلکتی ہے۔ غالبؔ نے اپنے پیش رووں کی طرح حد درجہ ثقیل و دقیق تراکیب و الفاظ کا استعمال نہیں کیا ہے بلکہ برجستگی اور بے تکلفی کی کیفیت پیدا کرتے ہوئے انھوں نے انتہائی سادگی اور روانی سے اپنا مطلوبہ ماحول بنانے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ مہ نو سے خطاب والے قصیدے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ تہنیتِ عید کے لیے شعر گوئی کر رہے ہیں مگر یہی تشبیب مدحِ شاہ میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد نے اس قصیدے کی تشبیب کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ غالبؔ نے یہاں بالکل نیا راستہ نکالا ہے۔

غالبؔ نے گریز کے اشعار میں بھی جدت سے کام لیا ہے۔ اپنے سب سے مشہور قصیدے میں جہاں وہ ماہ نو سے ہم کلام ہیں اور تشبیب کے عمدہ اور لاجواب اشعار سے قصیدے کے لیے فضا ساز گار کر رہے ہیں، وہیں انھوں نے گریز کا انتہائی شوخ مضمون نکالا ہے۔ وہ ماہ نو سے دریافت کرتے ہیں کہ بتاؤ یہ مہ و مہر کس کے در پر ماتھا جھکاتے ہیں۔ پھر ماہ نو کی خاموشی کے بعد کہتے ہیں کہ تجھے نہیں پتہ تو میں بتاتا ہوں۔ وہ شخص جس کے در پر مہ و مہر

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار)

جھکے رہتے ہیں، وہ کوئی اور نہیں میرا ممدوح شہنشاہ بلند مقام ہے۔ غالبؔ کی یہ خوبی ان کے قصیدے 'دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں' میں بھی نمایاں ہے جہاں وہ کائنات کو معشوق حقیقی کی ذات کا جلوہ قرار دیتے ہیں اور کائنات ارضی اور مالک حقیقی کے حوالے سے فلسفیانہ مباحث کو تشبیب کے شعروں میں ڈھالتے ہیں۔ پھر انھیں احساس ہوتا ہے کہ کہاں دنیا اور علائق دنیا میں محو ہو گیا ہوں اور ایسی بے ہودہ گفتگو کر رہا ہوں جو وقار و تمکین کے آداب سے باہر ہے۔ پھر گریز کا یہ شعر مدحِ علیؓ کی راہ ہموار کرتا ہے:

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں

مدح قصیدہ کا اہم جزو ہے اور تعریف و توصیف میں زورِ کلام صرف کرنا اور مبالغہ آرائی سے کام لینا قصیدہ گو شعرا کا شیوہ رہا ہے۔ غالبؔ کے قصیدوں میں مدح کی وہ کیفیت نہیں جو سوداؔ اور ذوقؔ جیسے بڑے قصیدہ گو شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ بعض ماہرین نے اس کا سبب غالبؔ کی خوددار طبیعت کو قرار دیا ہے۔

غالبؔ کے مدحیہ اشعار دیکھیں تو وہاں معیاری الفاظ و تراکیب اور شکوہ الفاظ کے ساتھ ساتھ رفعتِ تخیل اور معنی آفرینی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے قصیدوں میں سادہ گوئی کا خصوصی پہلو بھی متاثر کن ہے۔ وہ اپنے ممدوح کی مدح میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے ہیں اور قیصر روم کو بہادر شاہ جیسے مجبور بادشاہ کا جاں نثار قرار دیتے ہیں اور اسے عظیم اسلامی شخصیات کی طرح صوفی و قطب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ غالبؔ کے یہاں مدح کے اشعار پر توجہ تو ملتی ہے البتہ وہ بلندی و عظمت نہیں دکھائی دیتی جو سوداؔ یا ذوقؔ کے مدحیہ اشعار میں ملتی ہے لیکن ان کے مدحیہ اشعار میں سہل ممتنع کی کیفیت ملتی ہے جو ان کے زورِ بیان اور قادرالکلامی پر دال ہے۔ غالبؔ کے قصیدے کے دعائیہ اشعار میں ان کا کمال جھلکتا ہے۔ یہ اشعار برمحل اور مختصر بھی ہیں اور ان میں تاثر بھی ہے۔ ان کے حسن طلب اور دعا گوئی کا انداز نرالا اور دل چسپ ہے۔ وہ اپنے دعائیہ اشعار میں ذاتی اغراض کو جگہ نہیں دیتے۔ اسی سبب ان کے دعائیہ اشعار میں ایک خلوص نظر آتا ہے۔ ان کے قصیدہ 'دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں' کا دعائیہ شعر دیکھیے جس میں محبانِ اہلِ بیت کو دعا اور دشمنانِ اہلِ بیت کو بد دعا دی گئی ہے۔ اس طرح کا ایجازِ بیان اور عمدہ الفاظ و تراکیب کا استعمال غالبؔ کی فن کاری کا بین ثبوت ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

صرف اعدا، اثر شعلہ و دود دوزخ
وقف احباب گل و سنبلِ فردوس بریں

ان کے ایک مدحیہ قصیدے کا یہ شعر تو زبان زد خاص و عام ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مذکورہ گفتگو سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مرزا غالبؔ اُردو کے ایک اہم اور ممتاز قصیدہ نگار ہیں۔ مولوی عبدالسلام نے غالبؔ کے قصائد کو 'اُردو زبان کے لیے مایۂ صدفخر و نازش' قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر چہ یہ قصائد 'ایشیائی قصیدہ گوئی کے محاسن' سے خالی ہیں لیکن اس کی سلاست، روانی، متانت، جزالت اور تشبیب نے اُردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ غالبؔ نے اوروں سے مختلف ڈگر اپنا کر اپنے قصیدوں کو الگ معیار عطا کیا ہے۔ اسی لیے ماہرینِ فن کا خیال ہے کہ جہاں ذوقؔ جیسے بڑے قصیدہ نگاروں کے یہاں مغلق الفاظ اور علمی اصطلاحات سے شان وشکوہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہیں غالبؔ کے قصیدوں میں شان دار الفاظ وتراکیب اور متانت و جزالت ملتی ہے اور ثقل، اغلاق یا ابہام کا گزر نہیں ہوتا۔ اسی طرح غالبؔ کے قصائد کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ان میں بے جا مدح سرائی کا پہلو نظر نہیں آتا۔ غالبؔ کے قصیدوں کا ایک اور امتیازی اور انفرادی پہلو ان میں غزلیہ اشعار کی شمولیت ہے۔ مدحِ شاہ سے متعلق آخری دونوں قصیدوں میں غزل کے اشعار موجود ہیں جو غزل سے غالبؔ کے انتہائی لگاؤ پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ غالبؔ نے کم لکھنے کے باوجود اُردو قصیدہ نگاری میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ ان کے قصیدوں کی تشبیبیں فن پر ان کی دسترس کی گواہ ہیں اور مدح ودعا کے اشعار ان کی شاعرانہ مہارت کی دلیل ہیں۔

7.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

(قصیدہ بعنوان قصۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت: منتخب اشعار)

ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار
سایۂ لالۂ بے داغ، سُوَیدائے بہار

مستی بادِ صبا سے ہے بہ عرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سبز ہے جامِ زُمرّد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستی ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اِس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموری شوقِ بلبل
راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بے دار

سونپے ہے فیض ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دوجہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بے کار

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

مے کدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
بھول جا یک قدح بادہ بہ طاقِ گل زار

موج گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تُو دستار

کھینچے گر مانی اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِّ پرکار

لعل سی کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطی سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار)

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجوم خم دوشِ مزدور
رشتۂ فیض ازل ساز طناب معمار

سبزۂ نُہ چمن و یک خط پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاہ
وہ رہے مِروحۂ بالِ پری سے بے زار

خاکِ صحرائے نجف، جوہر سیر عرفا
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بخت بے دار

ذرّہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ نار
گرد اُس دشت کی، امید کو اِحرامِ بہار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستی ناز
عرض خمیازہ ایجاد ہے ہر موجِ بہار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گل زار

شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانۂ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہ ہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردُوں
سلکِ اختر میں مہ نو، مژۂ گوہر بار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم، مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان و دگر سُو غمِ خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئنہ دار

دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

ماخذ: دیوانِ غالب، مرتبہ: غلام رسول مہر، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۶۷ء

عزیز طلبا! ابھی آپ نے مرزا غالبؔ کے ’قصیدہ بعنوان قصۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت‘ کے جن منتخب اشعار کی قرأت کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

مولانا غلام رسول مہر کے مطابق یہ منقبت ایک سو دس (۱۱۰) اشعار کی تھی جسے مرزا غالبؔ نے ’قصۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت‘ کا نام دیا تھا۔ اس قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے جو گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر میں دو اشعار دعا کے ہیں۔ اس قصیدے کے مطلع میں غنائیت اور روانی ہے مگر وہ برجستگی نہیں جو عموماً قصائد کے مطلع میں ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ان کے دوسرے قصیدے کا مطلع زیادہ اعلیٰ ہے جو انھوں نے حضرت علیؓ کی ہی منقبت میں لکھا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

غالبؔ کو حضرت علیؓ سے خاص عقیدت تھی اور دیوانِ غالبؔ میں شامل پہلے دونوں قصیدے اس عقیدت کا بین ثبوت ہیں۔ غالبؔ کی شاعری میں فکر و خیال کی بلندی اور فلسفیانہ افکار کی پیش کش نمایاں طور پر موجود ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب میں بھی غالبؔ کے تخیل کی پرواز نظر آتی ہے۔ دیکھیے انھوں نے موسمِ بہار کے جوشِ نمو کو اپنے تخیل کی بلند پروازی سے کس طرح بیان کیا ہے:

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ انداز ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بے کار

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اگر چہ اس قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے مگر مجموعی طور پر بہار کی کوئی جامع تصویر بنتی نظر نہیں آتی ہے بلکہ فلسفیانہ مضامین و افکار کا اظہار ہوتا ہے۔ قصیدہ کا عمومی رنگ فارسی زدہ ہے۔ فارسی الفاظ و تراکیب اور سنگلاخ زمین نے اس میں ثقالت اور ژولیدہ بیانی پیدا کر دی ہے۔ اگر چہ اس میں الفاظ و تراکیب فنِ قصیدہ گوئی کے مطابق ہی استعمال ہوئے ہیں تاہم اس کی پوری زمین بوجھل معلوم ہوتی ہے۔ غالبؔ کے دیگر تین قصائد کے بالمقابل اس قصیدہ کو فنی سطح پر زیادہ کام یاب نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے۔ گریز کا ایک شعر ہے جب کہ آخر میں دو اشعار دعا کے ہیں۔ قصیدے کا پہلا مطلع دیکھیے:

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار
سایۂ لالۂ بے داغ، سُوَیدائے بہار

ساز یک ذرہ سے مراد ایک ذرہ کا وجود اور سویدائے بہار سے مراد سویدائے دل بہار ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ چمن کے فیض کے سبب باغ کا کوئی بھی ذرہ بے کار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ لالۂ بے داغ کا سایہ جو بہ ظاہر بے کار نظر آتا ہے، وہ بھی چمن کی دل کشی و رعنائی میں اضافہ کر رہا ہے کیوں کہ وہ بہار کے دل کا سویدا بنا ہوا ہے۔ یاد رہے کہ لالہ داغ دار ہوتا ہے اور یہاں اسے بے داغ کیوں کہا گیا ہے، اس سلسلے میں نظم طباطبائی نے اہم اشارے کیے ہیں۔ ان کے مطابق لالے کی صفت بے داغ لانے سے دو باتیں پیدا ہوئی ہیں۔ پہلی بات تو رنگ بہار کی خوبی یہ ہے کہ لالے میں داغ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ داغ اگر لالے میں ہوتا تو وہی سویدائے بہار ہوتا لیکن جب اس میں داغ نہیں ہے تو اس کے سایے میں تناسب وحسن سویدائے بہار کا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد غالبؔ نے قدرتی مناظر اور ماحول پر گیارہ اشعار تشبیب کے کہے ہیں۔ ان اشعار میں کہا گیا ہے کہ ہر طرف جو سبزہ پھیلا ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صبا نے مستی میں آ کر مے کے پیالے کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ پھر بہار کی تاثیر کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ چیتے کے سیاہ داغ جام زمرد کی طرح سبز ہو گئے ہیں۔ ابر کی مستی نے ہر فرد کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے جس سے حسرت دل بھی طرب اندوز ہو رہی ہے۔ بہار آنے سے کوہ و صحرا میں بلبل کے ترانے گونج رہے ہیں اور ویران راستوں کو نئی کلیوں نے پُر رونق بنا دیا ہے۔ اسی طرح کئی اور اشعار میں بہاریہ مضمون کو پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد گریز کا یہ شعر ہے:

لعل سے کی ہے پے زمزمۂ مدحت شاہ
طوطی سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

اس شعر میں سبزۂ کوہسار کو طوطی اور لعل کو طوطی کی منقار (چونچ) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سرخ چونچ کی طوطی تیری (حضرت علیؓ) کی مدحت سرائی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد مدح کے اشعار ہیں جس میں حضرت علیؓ کی تعریف وتوصیف بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ وہ شہنشاہ ہیں جن کے گھر کی تعمیر کے لیے اینٹ چشم جبریل کے سانچے میں بنی ہے۔ ان اشعار میں حضرت علیؓ کے روضے کی نسبت سے شہر نجف کی تعریف بھی بیان کی گئی ہے۔ مدح کا یہ سلسلہ سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد قصیدے کا دوسرا مطلع ہے:

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گل زار

شمع شبستان بہار سے مراد شاعر کا ممدوح یعنی حضرت علیؓ ہے۔ شبستان سے مراد رات بسر کرنے کی جگہ ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ اے میرے ممدوح آپ کے فیض سے پروانوں کے دل چراغاں اور بلبلوں کے بال و پَر گل زار ہو رہے ہیں۔ دل چراغاں بننے یا بال و پر گل زار ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں جو کچھ مطلوب تھا، وہ مل گیا ہے۔ اس شعر کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ پروانے کا معشوق چراغ ہوتا ہے جب کہ بلبل کو پھول کی آرزو رہتی ہے۔ یہاں شاعر کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کی مراد اور مطلوب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طفیل میں حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد چھے اشعار میں حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کی فضیلت اور ان کے مقام و مرتبے کو بیان کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کی دیدار کی خواہش میں آئینہ خانہ مور کی طرح پرواز کرتا ہے۔ حضرت حسینؓ کے غم میں آنکھوں سے نکلنے والے آنسو موتی کا رتبہ رکھتے ہیں اور خاکِ نجف کی اولاد کے سوگ میں مژۂ گردوں تک اشک بار ہے یعنی آسمان آنسو بہا رہا ہے۔ آگے کہا گیا ہے کہ عبادت کے لیے حضرت علیؓ کا نقش قدم سجدہ گاہ ہے اور ان کی بہادری اور حوصلے کی مثال سے ریاضت کو تقویت ملتی ہے۔ اگلے شعر میں کہا گیا ہے کہ آپؓ کی مدح سرائی رسول کی مدح سرائی ہے۔ آخر میں دو اشعار دعا کے ہیں۔ پہلے شعر میں آل نبیؐ کے دشمن کو بد دعا دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ آل نبیؐ کے دشمن کو کبھی دنیا کی خوشی نصیب نہ ہو۔ پھر آخری شعر میں شاعر حضرت علیؓ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ میں حضرت علیؓ کی مدح میں ہمہ تن شوق بنا ہوا ہوں اور منقبتِ علیؓ کے فیض سے میری تحریر لبریز ہے۔

7.3.4 ماحصل

مرزا غالبؔ کا شمار اُردو زبان کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ شعروادب کی دنیا میں وہ بڑے شاعر، فن کار، نثر نگار اور ادبی نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ماہرین زبان وادب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ۱۹ ویں صدی غالبؔ کی صدی ہے۔ غالبؔ فارسی زبان وادب سے ازلی مناسبت اور شعر گوئی کا طبعی وفطری ذوق رکھتے تھے۔ اسی بنا پر انھیں فنِ شاعری میں اعلیٰ مقام نصیب ہوا۔ انھوں نے متعدد علمی وادبی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ غالبؔ نے غزل کے علاوہ قصیدے بھی کہے ہیں لیکن کم تعداد میں۔ ان کے منتخب اُردو دیوان میں صرف چار مختصر قصیدے ہیں۔ ان میں دو قصیدے حضرت علیؓ کی منقبت میں ہیں اور دو قصیدوں میں بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ بلاشبہ کمیت کے اعتبار سے غالبؔ کے قصیدے کم ہیں تاہم ان کا انفرادی انداز ان قصیدوں کو اہم مقام عطا کرتا ہے اور اسی سبب سے غالبؔ کو سوداؔ، ذوقؔ اور مومنؔ جیسے نمائندہ قصیدہ گو شعرا کی صف میں شامل کیا جاتا ہے۔ غالبؔ نے کم لکھنے کے باوجود اُردو قصیدہ نگاری میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ ان کے قصیدوں میں ان کی انفرادیت اور جدت نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کے قصیدوں کی تشبیہیں فن پر ان کی دسترس کی گواہ ہیں اور مدح ودعا کے اشعار ان کی شاعرانہ مہارت کی دلیل ہیں۔

7.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- مرزا غالب کے سوانحی احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- مرزا غالب کی قصیدہ نگاری سے بحث کی۔
- مرزا غالب کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- مرزا غالب کے قصیدہ بعنوان 'قصۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت' کے منتخب اشعار کی قرأت کی۔
- مرزا غالب کے قصیدہ بعنوان 'قصۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھا۔

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مرزا غالبؔ کے سوانحی احوال وکوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ مرزا غالبؔ کے فارسی قصائد سے متعلق اپنی معلومات درج کیجیے۔

۳۔ مرزا غالبؔ نے اُردو میں کل کتنے قصیدے تحریر کیے؟

۴۔ مرزا غالبؔ کی قصیدہ نگاری کی انفرادیت سے بحث کیجیے۔

۵۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

7.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مرزا غالبؔ کا خاندان ترکوں کے قبیلے ایبک سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی ولادت ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں ہوئی۔ دادا کا نام قوقان بیگ خاں، والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ پانچ برس کی عمر میں شفقت پدری سے محروم ہونے کے بعد چچا نصراللہ بیگ کے زیرِ کفالت آئے اور آٹھ نو برس کی عمر میں چچا کے سایے سے محروم ہونے کے بعد اپنی ماں کے ساتھ ننھیال میں رہے۔ بچپن کا زیادہ تر وقت کھیل کود اور تفریح میں گزرا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ باضابطہ تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود اپنے محلے کے علمی ماحول نے انھیں علم کا گرویدہ بنا دیا۔ ان کی شادی محض تیرہ برس کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی جن سے ان کو سات اولادیں ہوئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی پندرہ مہینے سے زیادہ باحیات نہ رہی۔ مرزا غالبؔ کا بچپن ننھیال میں لطف و مسرت کے ساتھ گذرا لیکن شادی کے کچھ سال بعد وہ پوری زندگی دہلی میں رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد مختلف قسم کے ناسازگار حالات سے دوچار ہوئے۔ مرزا غالبؔ شاعرانہ کمال کے سبب نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ جیسے خطابات سے نوازے گئے۔ مرزا غالبؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ مالی پریشانیوں میں گھرا رہا۔ آخر عمر میں انھیں مختلف قسم کے امراض نے آ گھیرا۔ بالآخر ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں اس عظیم شاعر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ دہلی دروازے کے باہر ان کی نماز جنازہ ہوئی اور حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے قریب ایک احاطے میں ان کی تدفین ہوئی۔

۲۔ مرزا غالبؔ کے فارسی کلیات میں متعدد قصیدے شامل ہیں جن میں ایک قصیدہ اپنی تعریف میں، دو نعتیہ قصیدے، دس منقبتی قصائد، ایک اکبر شاہ ثانی کی مدح میں، پندرہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں، تین ملکۂ وکٹوریہ کی تعریف میں، سترہ دیگر انگریز حکام کی شان میں، سات سرکار اودھ کی مدح میں، گیارہ قصائد دیگر عمائدین کی تعریف میں اور ایک قصیدہ ضیاء الدین نیر کی شان میں ہے۔

۳۔ مرزا غالبؔ نے اُردو میں زیادہ قصیدے نہیں کہے ہیں۔ ان کے منتخب اُردو دیوان میں صرف چار مختصر قصیدے موجود ہیں۔ ان میں دو قصیدے حضرت علیؓ کی منقبت میں ہیں اور دو قصیدوں میں بادشاہِ وقت

بہادر شاہ ظفؔر کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق غالبؔ کے اُردو قصیدوں کی کل تعداد نو ہے لیکن غالبؔ نے بعض قصائد کو منسوخ کر دیا تھا، اس لیے بنیادی طور پر غالبؔ کے چار ہی قصیدے ہیں۔

۴۔ مرزا غالبؔ اُردو کے ایک اہم اور ممتاز قصیدہ گو شاعر ہیں۔ انھوں نے اوروں سے مختلف ڈگر اپنا کر اپنے قصیدوں کو الگ معیار عطا کیا ہے۔ ان کے قصیدوں میں شان دار الفاظ وتراکیب اور متانت وجزالت ملتی ہے لیکن ثقل، اغلاق یا ابہام کا گزر نہیں ہوتا۔ اسی طرح غالبؔ کے قصائد کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ان میں بے جا مدح سرائی کا پہلو نظر نہیں آتا۔ غالبؔ کے قصیدوں کا ایک اور امتیازی اور انفرادی پہلو ان میں غزلیہ اشعار کی شمولیت ہے۔ انھوں نے کم لکھنے کے باوجود اُردو قصیدہ نگاری میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ ان کے قصیدوں کی تشبیبیں فن پر ان کی دسترس کی گواہ ہیں اور مدح ودعا کے اشعار ان کی شاعرانہ مہارت کی دلیل ہے۔

۵۔ پہلے شعر میں آل نبیؐ کے دشمن کو بددعا دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ آل نبیؐ کے دشمن کو کبھی دنیا کی خوشی نصیب نہ ہو۔ پھر آخری شعر میں شاعر حضرت علیؓ سے عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ میں حضرت علیؓ کی مدح میں ہمہ تن شوق بنا ہوا ہوں اور منقبتِ علیؓ کے فیض سے میری تحریر لبریز ہے۔

7.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
افاقہ	:	ہوش میں آنا، مرض میں کمی
قفسِ عنصری	:	قالب خاکی، جسم انسانی
بذلہ سنجی	:	لطیفہ گوئی، ظرافت، خوش طبعی
تواضع	:	انکسار، عاجزی، مہمان نوازی، خاطر مدارت
وجیہہ	:	خوب صورت
وظیفہ	:	وہ مخصوص رقم جو کسی بادشاہ یا حکومت کی طرف سے کسی خدمت کے اعتراف کے لیے ماہ بہ ماہ مقرر کر دی جائے، ملازمت سے سبک دوش ہونے پر ہر ماہ ملنے والی رقم، پنشن

مرزا اسداللہ خاں غالب: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار)

خلعت	:	لباس اشرف، وہ لباس جو بادشاہ یا امرا کی طرف سے انعام یا عزت افزائی کے طور پر ملے یہ کم از کم تین پارچوں پر مشتمل ہوتا تھا یعنی دستار، جامہ، کمر بند
منقبت	:	شاعری میں اہلِ بیت اور صحابہ کی شان میں تعریفی اشعار کو منقبت کہا جاتا ہے
کمیت	:	تعداد جو گنی جائے یا مقدار جو ناپی یا تولی جائے
جدت طرازی	:	نیا پن، نئی روش
اہل بیت	:	حضورؐ کی ازواج مطہرات اور حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، امام حسنؓ و حسینؓ اور ان کی ذریات کے لیے اہل بیت کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے
دادو دہش	:	بخشش و عطا، خیر خیرات
بہاریہ	:	بہار سے منسوب، قصیدہ جس کے آغاز میں بہار کا ذکر ہو
ہلال	:	ماہ نو، قمری مہینے کی پہلی سے تیسری رات کا چاند، عید کا چاند
سُوَیدا	:	نقطۂ سیاہ، سیاہ دھبہ
زُمُرّد	:	جواہرات میں سے ایک سبز رنگ کا پتھر جو زیورات میں استعمال ہوتا ہے
گلچین	:	باغباں، مالی، پھول توڑنے یا چننے والا
فشار	:	بے ہودہ بات، بکواس، گالی، نچوڑنا، دباؤ
مژگان	:	پلکیں
طاؤس	:	مور
قدح	:	بڑا پیالہ، شراب کا پیالہ، ساغر
زمزمہٗ	:	خوش الحانی، دھیمے سروں کا راگ، نغمہ، گانا
منقار	:	پرند کی چونچ، ٹھونگ
طناب	:	رسّی، وہ رسّا جس کے اوپر بازی گر کرتب دکھاتا ہے
تمثال	:	مورت، خیالی تصویر، پیکر

7.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ یادگار غالبؔ	:	خواجہ الطاف حسین حالیؔ
۲۔ احوال غالب	:	پروفیسر مختارالدین احمد
۳۔ خطوط غالبؔ کی روشنی میں غالبؔ کی سوانح عمری	:	ڈاکٹر تنویر احمد علوی
۴۔ اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	:	پروفیسر محمود الٰہی
۵۔ اُردو میں قصیدہ نگاری	:	ڈاکٹر ابو محمد سحر

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 8 محمد محسنؔ کاکوروی: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس وتفہیم

(سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل)

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 محمد محسنؔ کاکوروی: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس وتفہیم

8.3.1 محمد محسنؔ کاکوروی کے سوانحی احوال وکوائف

8.3.2 محمد محسنؔ کاکوروی کی قصیدہ نگاری

8.3.3 متن کی تدریس وتفہیم

8.3.4 ماحصل

8.4 آپ نے کیا سیکھا؟

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

8.6 سوالوں کے جوابات

8.7 فرہنگ

8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- محسنؔ کاکوروی کے سوانحی احوال وکوائف سے واقف ہوں گے۔
- محسنؔ کاکوروی کی قصیدہ نگاری سے بحث کریں گے۔
- محسنؔ کاکوروی کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- محسنؔ کاکوروی کے قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلینؐ' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے۔
- محسنؔ کاکوروی کے قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلینؐ' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھیں گے۔

8.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائیوں میں آپ مرزا محمد رفیع سوداؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور مرزا غالبؔ کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کی قصیدہ نگاری کی فنی خصوصیات وامتیازات سے واقف ہوئے۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز قصیدہ نگار محسنؔ کاکوروی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے، ان کی قصیدہ نگاری سے بحث کریں گے اور ان کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات اور اس کے فنی محاسن سے آگاہ ہوں گے، ساتھ ہی ان کے مشہور قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلین' کے منتخب اشعار کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح کو سمجھیں گے۔

8.3 محمد محسنؔ کاکوروی: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

8.3.1 محمد محسنؔ کاکوروی کے سوانحی احوال و کوائف

محسنؔ کاکوروی سیّد علوی تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی سے ہو کر حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد کا وطن قصبہ صحرام، توابع خواف تھا جو بغداد اور خراسان کے درمیان واقع ہے۔ ان کے خاندان کے ایک شخص قاری محمد صدیق جو ابو محمد خافی کے نام سے معروف تھے، ہندوستان آئے۔ بعد میں ان کی اولاد میں قاری امیر سیف الدین نے سکندر لودھی یا ابراہیم لودھی کے عہد میں اپنا وطن کاکوری کو منتخب کیا۔ اس وقت سے ہی یہ خاندان کاکوری میں سکونت پذیر ہو گیا۔ محسنؔ کاکوروی ۱۸۲۶ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش دادا مولوی حسین بخش کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اور ان سے ہی انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ محسنؔ کاکوروی کے والد مولوی حسن بخش شاعر اور باکمال مصنف تھے۔ ان کی ایک ضخیم کتاب 'تفریح الاذکیا فی احوال الانبیاء' شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں حضرت آدمؑ سے لے کر نبی کریم ﷺ تک کے حالات درج ہیں۔ آپ کا گھرانہ مذہبی بھی تھا اور علمی بھی۔ اپنے علمی گھریلو ماحول کے سبب اور والد محترم اور جدامجد کے ذریعے محسنؔ کاکوروی کے اندر علم کا ذوق و شوق اور تصوف کا رجحان پیدا ہوا۔ مشرقی علوم سے انھیں گہری واقفیت تھی اور یہ چیز ان کی گھٹی میں بس گئی تھی۔ انھیں پتنگ بازی کا بے حد شوق تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ شاعری میں منتقل ہو گیا۔ ۹ ر برس کی عمر میں نبی کریم ﷺ کی زیارت خواب میں ہوئی جسے انھوں نے فارسی شاعری میں بڑے شوق سے پیش کیا۔ اپنے دادا کی شہادت کے بعد محسنؔ اپنے والد کے ساتھ مین پوری میں رہے جہاں انھوں نے اپنے والد اور مولوی عبدالرحیم سے تحصیل علم کی۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ہائی کورٹ میں وکالت کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کی اور آگرہ میں عدالتی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ بعد ازاں وہ متھرا میں منصف مقرر ہوئے مگر اہلِ ذوق کی صحبتیں تو آگرہ میں تھیں، لہٰذا روح کی غذا کو ترجیح دیتے ہوئے انھوں نے آگرہ میں ہی قیام کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد آگرہ کو الوداع کہتے ہوئے کاکوری میں انھوں

نے مستقل سکونت اختیار کی۔ ان کی دیانت داری اور راست بازی کے سبب ہر جگہ کے لوگ حتی کہ صوبے کے حکام بھی ان کو وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے بھائی انوارالحسن نے جب ایل۔ ایل۔ بی مکمل کیا تو محسن نے وکالت، کاروبار اور زمین داری سے بےتعلقی اختیار کر لی اور شعر و شاعری، تصنیف و تالیف اور مطالعے میں انھوں نے خود کو مصروف کر لیا۔

محسن کاکوروی اطاعتِ والدین میں بے مثل تھے۔ کبھی اپنے والد کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ تمام شہر بلا تفریق مذہب و ملت ان کو اپنا سرپرست اور خیر خواہ سمجھتا تھا۔ وہ ہر کسی کے دُکھ درد میں شریک ہوتے اور اس کی اعانت فرماتے۔ انکسار ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ محسن کاکوروی پرانی وضع داری اور ایشیائی مروت کا بہترین نمونہ تھے۔ سفید اور صاف لباس زیب تن کرتے۔ قیمتی لباس پہننے سے گریز کرتے۔ سخاوت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو اسہال کبدی میں مبتلا ہوئے۔ ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو دس بجے دن میں آپ کا انتقال مین پوری میں ہوا اور والد مولوی حسن بخش مرحوم کے مزار کے قریب آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ 'گلدستہ رحمت'، 'ابیاتِ نعت'، 'مدیحِ خیرالمرسلین'، 'نظمِ دل افروز' اور 'انیسِ آخرت' آپ کے مشہور قصائد ہیں۔ آپ کی مشہور مثنویوں میں 'صبحِ تجلی'، 'چراغِ کعبہ'، 'شفاعت ونجات'، 'فغانِ محسن' اور 'نگارستانِ الفت' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی ٹھمریاں بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔

8.3.2 محمد محسن کاکوروی کی قصیدہ نگاری

اُردو قصیدہ نگاری میں بادشاہوں، سلاطین، امرا اور رؤسا کی مدح میں جہاں قصیدہ کہنے کی روایت تھی، وہیں مدحیہ، نعتیہ اور منقبتیہ قصائد بھی بڑی ہنرمندی سے کہے جاتے رہے ہیں۔ سودا، ذوق اور غالب کے علاوہ بھی شعرا کرام کی ایک فہرست ہے جنھوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ، رسولِ خدا اور حضرت علیؓ کی شان میں قصائد پیش کیے ہیں۔ ان شعرا میں ایک بے حد اہم نام محسن کاکوروی کا ہے جنھوں نے صرف نعتیہ قصائد ہی کہے ہیں اور اسی میدان میں اپنے شاعرانہ کمالات دکھائے ہیں۔ دراصل محسن کاکوروی میں نعت گوئی کی غیر معمولی قابلیت موجود تھی۔ نعت گوئی محض الفاظ کی سحر طرازی، تراکیب کی ندرت، خوش گفتاری، علمیت اور قدرت کلام سے نہیں کی جاتی بلکہ اپنے ممدوح کی محبت میں سرشاری، وابستگی اور غیر متزلزل عقیدت و مودت سے سرشار ہو کر کہی جاتی ہے۔ محسن کاکوروی میں یہ تمام صفات موجود تھیں۔ انھیں رسول اکرمؐ کی ذات مقدس سے بے انتہا محبت تھی۔ اسی محبت کے نتیجے میں انھوں نے نعتیہ قصائد کہنے میں اعلیٰ و ارفع مقام حاصل کیا ہے اور ان کی نعتوں میں ایک الگ سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس اعتبار سے محسن کاکوروی اُردو کے پہلے عظیم شاعر ہیں جن کی شاعری کا موضوع نعت ہے اور جن کی نعت میں فکری عناصر کی جو فراوانی ہے، اس کی مثال اُردو کے کم شاعروں کے کلام میں ملتی ہے۔ محسن کاکوروی کو حسان وقت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ خواب میں رسول پاک

صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے سرفراز ہوئے تھے۔اس لیے وہ محبت رسول میں ڈوب کر نعت کہتے تھے۔

محسنؔ کاکوروی کے کلیات میں کل پانچ نعتیہ قصیدے ہیں۔ان قصیدوں کے تاریخی عنوان 'گلدستہ کلام رحمت' (۱۲۵۸ھ)، 'ابیاتِ نعت' (۱۲۷۴ھ)، 'مدیحِ خیر المرسلین' (۱۲۹۳ھ)، 'نظمِ دل افروز' (۱۳۱۸ھ) اور 'انیسِ آخرت' (۱۳۲۲ھ) ہیں۔یہ قصائد فنی پختگی اور ندرتِ بیان کی عمدہ مثال ہیں۔ان قصائد کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے ذریعے شاعر کسی دنیاوی صلے اور شاعرانہ شہرت یا عزت و نام وری کا متمنی نہیں ہے۔لہٰذا ایک ایک حرف سے نبی کریمؐ سے عقیدت و محبت اور خلوص کا رنگ ٹپکتا ہے۔قرآن و حدیث سے جس طرح وہ مضمون نکالتے ہیں، وہ ان کی خداداد ذہانت کا ثبوت ہے۔یہی وجہ ہے کہ فرسودہ مضامین سے ان کے قصائد پاک ہیں۔بیان میں شاعرانہ شوخی بھی ان کے اعلیٰ مذاق کی دین ہے۔البتہ یہ شوخی تہذیب و متانت کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی ہے۔یہ بات ان کی قادر الکلامی کی بیّن دلیل ہے۔بیان کے دوران اگر کہیں حدیث میں کسی امر کی تصریح نہیں ہوتی تو اس کو وہ اس انداز سے لکھتے ہیں کہ قاری صاف طور پر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس قدر حصّہ حدیث کا نہیں ہے بلکہ شاعر کی زبان حال عرض کر رہی ہے۔مبالغہ آرائی چوں کہ قصیدہ کا لازمی جزو ہے، لہٰذا محسنؔ اس کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔وہ نادر تشبیہات اور استعارات کے ذریعے ممدوح کی شان کا اظہار مبالغے کے ساتھ کرتے ہیں۔ان کی طبیعت کے سدا بہار ہونے کی وجہ سے ان کے قصائد میں شگفتگی اور زندہ دلی برقرار رہتی ہے۔الفاظ کی شوکت، شان و شکوہ، تخیل کی بلند پروازی اور بندش کی چُستی ان کے قصائد کے امتیازی اوصاف ہیں۔تشبیب اور گریز میں ان کو کمال حاصل ہے اور خاتمہ و مناجات میں وہ اپنی طرز کے موجد ہیں۔ہندوستانی تہذیب و معاشرت سے اپنے قصیدے کی تشبیب باندھنے، اس کے بعد بڑی خوش اسلوبی سے گریز کر کے نعت محمدؐ کی طرف نکل آنے میں انھیں غیر معمولی فنی مہارت حاصل ہے۔ان کی تشبیب میں بلا کی ندرت پائی جاتی ہے۔دوران تشبیب اور مدح انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور ان میں بھی انھوں نے عام روش سے ہٹ کر ایک خاص جدّت پیدا کی ہے۔وہ ان غزلوں کے ذریعے بہاریہ اور رندانہ مضامین کے امتزاج سے کئی اشعار میں سرمستی کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔نعتیہ قصائد تحریر کرنے کے باوجود انھوں نے بڑی حد تک معنی آفرینی، جوشِ بیان، تسلسلِ بیان، روانی اور برجستگی کی خصوصیات کو برقرار رکھا ہے۔ان کے نعتیہ قصائد کی خوبی یہ ہے کہ ان میں مشکل الفاظ سے اجتناب، تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کا نہایت سادہ اور دل چسپ استعمال ملتا ہے۔انھوں نے قرآن واحادیث سے اخذ کر کے مخصوص انداز کی تلمیحات و تشبیہات استعمال کی ہیں۔ان کے یہاں ہندوستانی تہذیب و روایات کی جلوہ گری پورے آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے انھوں نے کہیں کہیں ہندی الفاظ کا بھی سہارا لیا ہے۔نعتیہ قصیدہ گوئی میں محسنؔ کاکوروی کا امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے نعتیہ قصیدہ گوئی کی فضا کو لفظی و معنوی بلندی عطا کی ہے۔ان کے یہاں لفظوں کی تراش و خراش سے زبردست معنویت پیدا کی گئی ہے۔ان کے نعتیہ قصائد کی خوبی یہ ہے کہ اس سے عمل کی تحریک ملتی ہے۔

'گلدستہ کلام رحمت' محسنؔ کاکوروی کا پہلا قصیدہ ہے جس کی تشبیب بہاریہ ہے۔ یہ قصیدہ سیدھے سادے انداز میں لکھا گیا ہے۔ 'قصیدہ ابیاتِ نعت' انھوں نے کرامت علی شہیدی کے معروف قصیدے کی زمین میں تحریر کیا ہے۔ یہ قصیدہ معنی آفرینی اور نکتہ پردازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ 'نظمِ دل افروز' اور 'انیسِ آخرت' بھی ابیات نعت کے طرز کے قصائد ہیں لیکن ان کی زمین آسان ہے۔ ان میں صفائی، پختگی اور روانی مزید نکھر کر سامنے آئی ہے۔ ان قصائد میں تشبیب اور گریز لکھنے کا کوئی خاص اہتمام موجود نہیں ہے بلکہ آغاز میں ہی عشقیہ مضامین تحریر کرتے ہوئے رسالت مآب ﷺ کا تذکرہ کر دیا گیا ہے جس میں فضائل و محاسن بیان ہوئے ہیں۔ محسنؔ کاکوروی کا شاہ کار قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلین' ہے جسے غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی۔ یہ قصیدہ اپنی ایک مخصوص انفرادی شان رکھتا ہے۔ محسنؔ کاکوروی نے خود اس کو 'مستانہ قصیدہ' کہا ہے۔ یہ بات درست بھی ہے کیوں کہ اس قصیدے میں شروع سے آخر تک ایک طرح کی مستانہ فضا رقص کرتی رہتی ہے۔ اس قصیدے میں محسنؔ نے مروجہ ہیئت کا استعمال کیا ہے لیکن تشبیب میں گرد و پیش کے مانوس ماحول سے اخذ کر کے انھوں نے ایسے مضامین باندھے ہیں جو پہلے نعت گوئی میں جگہ نہیں پا سکے تھے۔ اس قصیدے کی تشبیب اگرچہ طویل ہے لیکن کہیں بھی زورِ بیان مجروح نہیں ہوتا۔ محسنؔ نے قصیدہ گوئی اور نعت گوئی کے لوازم و آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی نعت کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس قصیدے کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ خالص ہندوستانی فضا پورے قصیدے پر چھائی ہوئی ہے۔ بقول ابواللیث صدیقی ''ایسی نرالی تشبیب آپ کو اُردو کے کسی شاعر کے ہاں نہیں ملے گی۔ ذوقؔ و سوداؔ قصیدے کے بادشاہ ہیں لیکن ان کی کسی تشبیب میں ایسی جدت اور زور نہیں''۔

8.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

(قصیدہ مدیحِ خیر المرسلین: منتخب اشعار)

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا ، گنگا جل
گھر میں اشنان کریں، سرو قدانِ گوکُل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ہے، اِک طوُلِ امل
دُھرکا ترسا بچہ ہے برق، لیے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے، لیے آگ میں جل
ابر، پنجابِ تلاطم میں ہے، اعلا ناظم
برق، بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل
نہ کھلا، آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی

پندرہ روز ہوئے پانی کو، منگل منگل
دیکھیے، ہوگا سِری کرشن کا، کیوں کر درشن؟
سینۂ تنگ میں، دِل گوپیوں کا ہے بے کل
راکھیاں لے کے سلونوں کی، برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت، کوئی پل
اب کے میلا تھا ہنڈولے کا بھی، گرداب ِبلا
نہ بچا کوئی محافہ، نہ کوئی رتھ، نہ بہل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں، بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے، یہ بڑھوا منگل
جوگیا بھیس کیے، چرخ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بَیراگی ہے، پربت پہ بچھائے کمّل
دیکھتے دیکھتے بڑھ جاتی ہے گُلشن کی بہار
دیدۂ نرگسِ شہلا کو، نہ سمجھو احول
جگنو پھرتے ہیں جو گُلبُن میں تو آتی ہے نظر
مُصحفِ گُل کے حواشی پہ طِلائی جدوَل
جس طرف دیکھیے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فِرنگی کونسل
پھول ٹوٹے ہوئے پھرتے روِشوں پر ہیں نسیم
یا سڑک پر ہیں، ٹہلتے ہوئے گُلگُوں کوتل
آہِ قُمری میں مزا اور مزے میں تاثیر
سرو میں دیکھیے پھول آنے لگے، پھول میں پھل
چشمِ میکش میں گلابی ہے کہ پھولا ہے گلاب
پھول کیوڑے کا کِھلا ہے کہ کُھلی ہے بوتل
مے گلرنگ ہے کیا شمعِ شبِ فکر کا پھول
چلتے چلتے جو قلم ہاتھ سے جاتا ہے پھسل

کیا جنوں خیز ہے لکھنے میں صریرِ نےِ کلک
کہ سیاہی سے ہے ہرحرف کو سودے کا خلل

گلِ خوش رنگ رسولِ مدنیِ عربی
زیبِ دامان ابد، طُرّۂ دستارِ ازل

نہ کوئی اُس کا مشابہہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

مرجعِ روحِ امیں، زیب دہِ عرش بریں
حامیِ دینِ متیں، ناسخِ ادیان و ملل

ہفت اقلیم ولایت میں شہہِ عالی جاہ
چار اطرافِ ہدایت میں نبیِّ مُرسل

دَورِ خورشید کی بھی حشر میں ہوجائے گی صبح
تا ابد دورِ محمد کا ہے روز اوّل

تیری تشبیہہ کا ہے آئینہ خانہ تنزیہہ
شانِ بے رنگیِ مُطلق ہے تجھے رنگ محل

بحرِامکاں میں رسولِ عربی، دُرّ یتیم
رحمتِ خاصِ خداوندِ تعالیٰ بادل

قبلۂ اہلِ نظر، کعبۂ ابروئے حضور
موئے سر، قبلے کو گھیرے ہوئے کالا بادل

رشک سے شُعلۂ رُخسار کے، روتی ہے برق
بر ق کے منہ پہ ہے رکھے ہوئے پلّا بادل

دوُر پہنچی، لبِ جاں بخش نبی کی شُہرت
سُن ذرا کہتے ہیں کیا حضرتِ عیسیٰ بادل

چشمِ انصاف سے دیکھ آپ کے دندان شریف
دُر یکتا ہے ترا گرچہ یگانا بادل

تھا بندھا تار فرشتوں کا درِ اقدس پر

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

شبِ معراج میں تھا عرشِ معلّا بادل
ہفت اقلیم میں اِس دیں کا بجایا ڈنکا
تھا تری عام رِسالت کا گرجتا بادل
دینِ اسلام تری تیغِ دودم سے چمکا
یا اُٹھا قبلے سے دیتا ہوا کاندھا بادل
آستانے کا ترے دہر میں وہ رُتبہ ہے
کہ جو نکلا تو جھکائے ہوئے کاندھا بادل
تیغ میدانِ شجاعت میں چمکتی بجلی
ہاتھ، گلزارِ سخاوت میں برستا بادل
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
میرے ایمانِ مُفصّل کا یہی ہے مُجمل
دین و دُنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہو بھروسا تری قوت ترا بل
آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تادمِ مرگ
شکل تیری نظر آئے، مجھے جب آئے اجل
دمِ مُردن یہ اشارہ ہو شفاعت کا مری
فکر فردا کی نہ کر، دیکھ لیا جائے گا کل

عزیز طلبا! ابھی آپ نے محسنؔ کاکوروی کے مشہور قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلین' کے جن منتخب اشعار کی قرأت کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

محسنؔ کاکوروی کا یہ قصیدہ اُردو ادب میں شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس قصیدے کا نام 'مدیحِ خیر المرسلین' اس اعتبار سے رکھا ہے کہ اس سے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس قصیدے کے تمام اشعار لام پر ختم ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسے لامیہ قصیدہ بھی کہتے ہیں۔ یہ غیر مردف قصیدہ ہے اور اس کی زمین عرفیؔ کی ہے۔ سوداؔ نے بھی اسی زمین میں حضرت علیؓ کی منقبت میں لامیہ قصیدہ تحریر کیا ہے۔ اس قصیدے میں محسنؔ کاکوروی نے ہندوستانی اساطیر، ہندو روایات، صنمیات، ہندو مذہب، ہندوستانی تہذیب و عقائد اور اس سے متعلق تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ یہ پورا قصیدہ سرورِ کائنات کی تعریف اور شان میں ہے اور ہندوستانی

تہذیب میں مکمل طور پر رچا بسا ہوا ہے۔ اس کی یہی خصوصیت قصیدے کی تاریخ میں اسے امتیازی شان عطا کرتی ہے۔ ہندی لفظیات اور تراکیب کے استعمال نے اسے منفرد اور موسیقی آمیز بنا دیا ہے۔ قصیدے کی خوب صورتی اس کی پیش کش میں ہے۔ اُردو، عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت زبان کا حسین امتزاج اس قصیدے کی جان ہے۔ مختلف زبانوں کے الفاظ اس میں اس طرح برتے گئے ہیں کہ کہیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ محسنؔ کو جو عقیدت نبی کریم ﷺ سے تھی، وہ اس قصیدے کے حرف حرف سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرح کا والہانہ عشق اور شدت جذبات قصیدے کی رُوح میں شامل ہے۔

محسنؔ کاکوروی نے اس قصیدے کی تشبیب بہاریہ رکھی ہے جس میں ابر، برق، بادل اور بارش وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اور ہندو اساطیر کے استعمال سے اثر انگیزی عطا کی گئی ہے۔ تشبیہات و استعارات میں جا بہ جا لطافت اور نیا پن موجود ہے۔ بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر ''اس کی تشبیب میں مبالغہ اور تخیل آفرینی کے روایتی رنگ میں بھی بڑے برجستہ اشعار موجود ہیں''۔ اس قصیدے کی تشبیب اور مدح میں دو غزلیں بھی شامل ہیں جس کی ردیف بادل ہے مگر قافیہ بدل دیا گیا ہے۔ مستانہ فضا سے پُر تشبیب سے محسنؔ نے بڑے معنی آفریں طریقے سے گریز پیدا کی ہے۔ مدح میں بھی انھوں نے معنی آفرینی، جوشِ بیان، روانی اور برجستگی کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔ آخری حصہ پندرہ اشعار کی مناجات پر مشتمل ہے جس کا آغاز وہ ایک نئے مطلع سے کرتے ہیں۔ یہ قصیدہ ان کی تخلیقی قوت کی عمدہ مثال ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اس قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے۔ تشبیب کے اشعار میں موسمِ بہار کی تصویر کشی انتہائی دل چسپ طریقے سے کی گئی ہے۔ پہلے شعر میں کہا گیا ہے کہ کاشی (بنارس) کی طرف سے متھرا کی جانب بادل چلا جا رہا ہے یعنی اس کا سفر ایک مقدس مقام سے دوسرے مقدس مقام کی طرف ہو رہا ہے۔ بادل کو ہوا اُڑا کر لیے جا رہی ہے اور اس طرح گنگا جل بجلی کے کندھے پر سوار ہو کر آگے بڑھ رہا ہے۔ کاشی، متھرا اور گنگا جل کے ذکر کے ذریعے ہندوؤں کے مقدس مقامات اور پاکیزہ پانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ کاشی کی جانب سے متھرا کی طرف بادل اس لیے جاتا ہے تاکہ گوکل کی سرو قد حسینائیں گھر ہی میں اشنان کر لیں، نہا لیں اور اس تبرک سے فیض یاب ہو جائیں کیوں کہ جمنا پر جا کر نہانا بھی ان کی نزاکت کی وجہ سے لمبی آرزوؤں کے باندھنے کے مشابہ ہے۔ یعنی جمنا گھاٹ پہ جا کر نہانا ان کے لیے ایک دشوار اور مشکل کام ہے۔ اس شعر میں اشنان، گوکل اور جمنا کے الفاظ کاشی، متھرا اور گنگا کی مناسبت سے لائے گئے ہیں۔ تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور ان کے درمیان بجلی چمک رہی ہے۔ بادل کے درمیان چمکتی ہوئی بجلی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بجلی کسی اعلیٰ درجے کے آتش پرست کی اولاد ہے جو پانی میں اپنی آگ روشن رکھے ہوئے ہے۔ دوسری جانب بادلوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی اونچے درجے کا برہمن ہے جو آگ کے بیچ بھی اپنا گنگا جل سنبھالے ہوئے ہے۔ شعر کے دونوں مصرعوں کے آدھے حصے یعنی جل میں آگ اور آگ میں جل متضاد کیفیت پیدا کر رہے ہیں جس سے شعر کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ چوٹی اور

برہمن دونوں کا بیک وقت استعمال بھی شعر کے اندر رعایت پیدا کرتا ہے۔ چوتھا شعر ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے ساتھ ساتھ انگریزی نظام کی مستعدی کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پانی سے بھرا ہوا بادل آسمان پر جس طرف چاہے، دوڑتا پھرتا ہے۔ اس لحاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بادل تلاطم کے صوبۂ پنجاب کا ناظم اعلیٰ یعنی حاکم اعلیٰ ہے۔ دوسری جانب ان بادلوں کے درمیان برق یعنی بجلی ہر طرف دوڑتی پھرتی ہے۔ اسے دیکھ کر تشبیہ کے طور پر یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ برق تاریکی کے صوبۂ بنگالہ میں گورنر جنرل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابر اور پنجاب میں جس طرح تناسب ہے، اسی طرح برق اور ظلمت میں تضاد ہے۔ پانچویں شعر میں لگا تار ہونے والی بارش کا منظر ہے۔ اس شعر میں بارش کی کثرت اور تسلسل کا بیان ہے۔ کہا گیا ہے کہ دن کے آٹھ پہر میں دو چار گھڑی کے لیے بھی کبھی پانی رُکا نہیں۔ اس طرح مسلسل بارش کو منگل سے منگل تک پندرہ روز ہو گئے۔ یعنی ہر طرف موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور کسی بھی لمحے رُک نہیں رہی ہے۔ اس شعر میں صنعت سیاقۃ الاعداد، مراعاۃ النظیر اور صنعتِ تکرار پائی جاتی ہے۔

چھٹے شعر میں ہندوستان کی ایک قدیم رسم کا ذکر ہے۔ ہندوستان میں درشن کی باقاعدہ ایک رسم تھی جس میں بادشاہ یا عظیم شخصیت کو دیکھنے اور تحائف پیش کرنے کے لیے راستے کی دونوں جانب عورتوں کی صفیں آراستہ ہوتی تھیں۔ اس رسم کی مناسبت سے اس شعر میں کہا گیا ہے کہ بارش کی کثرت کی وجہ سے گوپیاں پریشان ہیں کہ ہم سری کرشن کا درشن کیسے کریں۔ دوسرے مصرعے میں گوپیوں کے اضطراب اور شوقِ دیدار کی کیفیت کا بیان ہے کہ گوپیوں کے تنگ سینہ میں دل بری طرح سے مچل رہا ہے۔ یہ شعر ہندوستان میں صنفِ نازک کی مثالی خوب صورتی کو بھی پیش کرتا ہے۔ ساتواں شعر ہندوستانی تہذیب اور مذہبی رسم کی نمائندگی کرتا ہے۔ راکھی کا تیوہار مقدس تیوہار ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ بارش کی کثرت کی وجہ سے گوپیوں کی طرح برہمن بھی متفکر ہیں لیکن بارش کا تار یعنی اس کا تسلسل کچھ گھنٹے اور کچھ پل کے لیے رُکے تو وہ رکشا بندھن کی راکھیاں لے کر نکلیں۔ آٹھویں شعر میں کہا گیا ہے کہ اس مرتبہ اس قدر بارش ہوئی ہے کہ ہنڈولے کا میلہ بلاؤں کا گھیرا بن گیا جس میں نہ تو کوئی ڈولی بارش کے طوفان میں پھنس جانے سے بچ پائی ہے اور نہ کوئی رتھ اور نہ بیل گاڑی۔ جو جہاں تھا بارش میں گرفتار ہو گیا۔ یہ شعر بارش کی کثرت سے متعلق ہے۔ نواں شعر ہندوستانی تہذیب کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اس شعر میں بنارس میں منائے جانے والے بڑھوا منگل میلے کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ اس سال بڑھوا منگل میلہ بھی سخت بارش میں منایا گیا۔ چوں کہ یہ میلہ گنگا کی سطح پر بجروں پر منایا جاتا ہے اور اس میں شرکت کرنے والے زیادہ تر نوجوان ہوتے ہیں۔ اس مناسبت سے کہا گیا ہے کہ ایسا لگتا تھا کہ بنارس کے رہنے والے گنگا میں بڑھوا منگل منانے نہیں جا رہے ہیں بلکہ ڈوبنے جا رہے ہیں کیوں کہ بہت سے لوگ بارش اور طوفان میں پھنس کر ڈوب گئے۔ اس طرح یہ بڑھوا منگل نوجوانوں کے حق میں سنیچر (شنی) یعنی منحوس بن گیا۔ سنیچر کو ہندو عقیدے میں منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں ہندو عقیدے اور رسوم کا تذکرہ ہندوستانی فضا کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ اس

طرح یہ شعر ہندوستانی تہذیب اور ہندو عقیدہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ نوجوان اور بڑھوا میں ایہام تضاد ہے۔ اسی طرح سنیچر اور منگل میں ایہام تناسب ہے۔ دسویں شعر میں کہا گیا ہے کہ آسمان پر چھائی ہوئی کالی گھٹا کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ آسمان کوئی جوگی ہے جس نے اپنے بدن پر بھبھوت یعنی راکھ مل لی ہے یا یہ کہیے کہ کالا بادل کسی بیراگی کی طرح ہے جس نے کسی پربت پہ جا کے اپنا کالا کمبل بچھا دیا ہے۔ یعنی چاروں طرف گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے جس سے ہر طرف اندھیرے کا سا ماحول ہو گیا ہے۔ گیارہویں شعر میں نشو و نما کی قوت کا بیان ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس موسم بہار میں نباتات کی نشو و نما میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ گلشن کی بہار دیکھتے دیکھتے بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے نرگسِ شہلا کی آنکھ اگر بہار کو دو چند دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں کو عیب دار اور احول یعنی بھینگی نہ کہو بلکہ اسے موسمِ بہار کا اثر سمجھو۔ گلشن، بہار اور نرگس میں رعایتِ لفظی ہے۔

بارہواں شعر منظر کشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ شاعر نے اس شعر میں ایک خوب صورت تشبیہہ مرکب پیش کی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ باغ میں گلاب کے پھول کے ارد گرد اس کی شاخوں کے درمیان جگنو چمکتے پھرتے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گلاب کا درخت بھی کسی کتاب کا صفحہ ہے جس کے چاروں طرف سنہری جدول کھینچ دی گئی ہے۔ یعنی حاشیہ بنا دیا گیا ہے۔ تیرہویں شعر میں موسمِ بہار کی مناسبت سے ایک خوب صورت منظر پیش کیا گیا ہے اور پھر اس کی ایک خوب صورت تشبیہہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہہ ایک منفرد تہذیب وثقافت کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ چمن میں آپ جس طرف دیکھیں، دُوٗ رُدُوٗ رتک بیلے کی کلیاں کھلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ لوگ اس منظر کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ شاید یہاں انگریزوں کی کونسل ہو رہی ہے کیوں کہ وہ سفید فام ہوتے ہیں۔ اس شعر میں تشبیہ مرکب ہے۔ بیلے کے پودوں کے اوپر کھلے ہوئے سفید پھولوں کو جو دُوٗ رُدُوٗ رتک پھیلے ہوئے ہیں، گورے انگریزوں کی کونسل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چودھویں شعر میں کہا گیا ہے کہ کچھ پھول درختوں کی شاخوں سے نیچے گر گئے ہیں اور بادِ نسیم انھیں روشوں پر پھرا رہی ہے یعنی وہ ہوا کے چلنے سے زمین پر ادھر ادھر پھیل اور بکھر رہے ہیں۔ یہ نیچے گرے ہوئے پھول روشوں پر اڑتے پھرتے ہوئے ایسے لگتے ہیں گویا سڑک پر سجاوٹ کے سرخ گھوڑے ٹہل رہے ہیں۔ پندرہویں شعر میں کہا گیا ہے کہ اس موسمِ بہار میں یہ نئی بات ہوئی کہ قمری کی آہ میں مزا پیدا ہو گیا ہے جو کبھی نہ ہوتا تھا اور یہ مزا ایک تاثیر بھی رکھتا ہے۔ دوسری جانب سرو کا درخت جس میں نہ کبھی پھول آتا ہے نہ پھل مگر اس موسمِ بہار میں اس پر بھی پھول دکھائی دے رہے ہیں اور پھل بھی۔ یعنی موسم کے اثر سے معمول کے مطابق ہونے والی باتیں بھی معمول کے خلاف کام کر رہی ہیں اور اس طرح موسم کے سبب نیا پن آ گیا ہے۔ سولھویں شعر میں کہا گیا ہے کہ میکش کی سرخ آنکھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شیشے کی رنگین پیالیاں ہیں یا کھلا ہوا گلاب۔ اسی طرح کیوڑے کے کھلے ہوئے پھول پر موسمِ بہار کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے شراب کی بوتل کھول کر رکھ دی ہے۔ گلابی اور گلاب میں تجنیس ناقص وزائد ہے۔ کِھلا اور کُھلا کا اجتماع بھی شعر کے آہنگ اور حسن میں اضافے کا باعث ہے۔ بلاغت کی اصطلاح میں اسے تجنیسِ خطی کہتے

ہیں۔

سترہویں شعر سے گریز کا آغاز ہوتا ہے۔اس شعر میں شاعر اس خیال کا اظہار کر رہا ہے کہ اس موسمِ بہار میں رات کے وقت شمع جلا کر میں فکرِ شعر میں مشغول ہوں لیکن اشعار قلم بند کرتے ہوئے بار بار قلم ہاتھ سے پھسل جاتا ہے تو کیا شمع کا پھول کوئی گل رنگ شراب ہے جس کی وجہ سے مجھ پر نشہ سا طاری ہو گیا ہے اور قلم بار بار انگلیوں سے پھسل جاتا ہے یعنی بہکنے اور بے خودی کی سی کیفیت مجھ پر طاری ہو رہی ہے۔ مطلب یہ کہ میرا ذہن کچھ تبدیل ہو رہا ہے اور میری کیفیت بھی بدل رہی ہے۔ مے گل رنگ اور پھول میں ایہامِ تناسب ہے۔اٹھارہویں شعر میں قلم اور اس کی آواز کو بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔شاعر اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ کیا قلم کی نلکی جو مثل ایک بانسری کے ہے، کاغذ پر لکھتے ہوئے اس سے نکلنے والی سرسراہٹ کی آواز جنون میں اضافہ کرنے والی ہے؟ کیوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ کاغذ پر لکھا ہوا ہر حرف سیاہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سودائی اور دیوانہ ہو گیا ہے۔عربی میں سودا کے معنی سیاہ کے ہوتے ہیں اور اُردو میں یہ لفظ مجنوں اور دیوانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے کالے یا سیاہ لکھے ہوئے الفاظ کو سودائی اور دیوانے سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔جنوں، سودا اور خلل میں ایہامِ تناسب ہے۔انیسواں شعر گریز کا ہے۔شاعر نے نہایت خوب صورتی سے گریز سے مدح کا مضمون پیدا کر دیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ میں نے باغِ تنزیہہ میں نہال تشبیہہ کے درمیان ایک خوش رنگ پھول دیکھا جو گویا رسول مدنیِ عربی کی تمثیل تھا۔یہ ایسا خوش رنگ پھول تھا جو ابد کے دامن کی زینت اور ازل کی پگڑی کی کلغی تھا۔یعنی آپ کی شخصیت ایک ایسے خوش رنگ پھول کی مانند ہے جو ازل اور ابد دونوں کے لیے سامانِ افتخار اور نشانِ امتیاز ہے۔ آپ کی شخصیت ایسی ہے کہ جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے اور آپ کی شخصیت اتنی منفرد ہے کہ دنیا کی ہر چیز سے الگ اس کی امتیازی شان ہے۔

بیسویں شعر سے مدح کا آغاز ہوتا ہے اور یہ شعر براہ راست مدح کا ہے۔اس سے شاعر کی قدرتِ کلام کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دونوں مصرعوں میں تین تین الفاظ لائے گئے ہیں اور تینوں الفاظ بالترتیب ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔مجموعی طور پر اس کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ نہ تو حُسنِ صورت میں حضورؐ پاک کا کوئی مشابہہ ہے، نہ مرتبے اور مقام میں کوئی آپ کا ہم پلّہ ہے اور نہ اوصاف میں کوئی آپ کا شریک ہے۔مصرعِ ثانی میں اسی مضمون کو دوبارہ ادا کیا گیا ہے لیکن اس میں ایک حسن یہ ہے کہ تینوں لفظوں کا خاتمہ حرفِ لام پر ہوتا ہے۔یعنی مماثل، مقابل اور بدل، یعنی نہ تو کوئی آپؐ کے جیسا ہے، نہ کوئی آپؐ کے برابر ہے اور نہ ہی کوئی آپؐ کا ثانی ہے، یعنی آپؐ جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔یہ شعر صنعتِ موازنہ کی بھی ایک عمدہ مثال ہے۔اکیسویں شعر میں کہا گیا ہے کہ ہمارے حضورؐ پاک فرشتوں کے سردار اور حضرت جبریل کے لیے بھی مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی وہ پلٹ پلٹ کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں اور عرش اعظم جس کا رتبہ نہایت بلند ہے، ہمارے حضورؐ پاک کی ذات نے اس عرش کو بھی زینت بخشی ہے۔آپؐ دینِ متین یعنی دین اسلام کے محافظ ہیں۔آپؐ پرانے

مذہبوں اور ملتوں کو منسوخ فرمانے والے ہیں یعنی آپؐ کی شریعت اور آپؐ کے لائے ہوئے مذہب نے پرانے مذاہب کو منسوخ کر دیا ہے یعنی ان مذاہب کی حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔ اب نجات کا ذریعہ صرف آپؐ کا دین اور آپؐ کی شریعت ہے یعنی مذہب اسلام ہی بامعنی ہے۔

بائیسویں شعر میں کہا گیا ہے کہ ہمارے حضورِ پاک تقربِ الٰہی میں پوری دنیا میں شہنشاہِ عالی جاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بہت مرتبے والے بادشاہ ہیں یعنی وہ تمام مقربینِ بارگاہِ الٰہی کے درمیان سب سے نمایاں اور سب سے ممتاز ہیں۔ وہ اللہ کے سب سے زیادہ نزدیک اور قریب ہیں۔ اسی طرح ہدایت و رہ نمائی میں وہ پوری کائنات میں نبیِ مرسل کے رُتبے پر فائز ہیں۔ یہاں نبیؐ کی عظمت بتانا مقصود ہے۔ تیئسویں شعر میں یہ بیان مقصود ہے کہ ہر شے کو فنا ہے مگر نبیؐ کے نام کو بقا ہے اور رہے گا۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن آسمان پر ہر روز طلوع ہونے والے سورج کی بھی صبح ہو جائے گی یعنی اس کا زمانہ ختم ہو جائے گا اور یہ دنیا فنا ہو جائے گی لیکن ہمارے حضور پاک ﷺ کا دورِ مبارک تا ابد اس طرح باقی رہے گا گویا ابھی اس کا روزِ اوّل ہے یعنی زمانہ کتنا ہی گزر جائے، وہ پہلے دن ہی کی طرح ہوگا۔ چوبیسویں شعر میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ پاک اللہ کے بندے اور مخلوق ہونے کے باوجود اپنے خالق سے سب سے زیادہ قربت اور تعلق رکھتے ہیں۔ اس مضمون کو شاعر اس طرح ادا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت تنزیہہ ایک آئینہ خانہ یعنی شیش محل ہے جس میں آپ کی تشبیہ یعنی صورت جھلکتی ہے، اسی طرح اللہ کی بے رنگیٔ مطلق کی شان آپ کے حق میں رنگ محل کی طرح ہے۔ پچیسویں شعر میں کہا گیا ہے کہ اس کائنات کو ایک سمندر فرض کر لیں تو اس کے درمیان رسول عربیؐ کی حیثیت درِ یتیم یعنی ایک اکیلے قیمتی موتی کی ہے (حضورؐ کو درِ یتیم بھی کہا جاتا ہے) اور اگر اللہ پاک کی خاص رحمت کی وسعت اور پھیلاؤ کو تشبیہہ دینا ہو تو اسے ان بادلوں سے تشبیہہ دیں گے جو آسمان پر چھائے ہوئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فیض اس قدر وسیع ہے جیسے آسمان میں پھیلے ہوئے بادل جو پوری دنیا کو سیراب کرتے ہیں۔

چھبیسویں شعر میں حضور پاکؐ کے ابروے مبارک اور گیسوے مبارک کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضور پاک ﷺ کے ابرو کعبے کی طرح مقدس اور پاکیزہ ہیں۔ اس لیے اہلِ نظر یعنی اربابِ بصیرت اسے اپنا مرکز و قبلہ سمجھتے ہیں اور چہرۂ مبارک کو گھیرے ہوئے آپ کے سر کے مبارک بال ایسے لگتے ہیں گویا کالے بادلوں نے قبلے کو گھیر لیا ہے۔ اس شعر میں نہایت عمدگی سے گیسوے مبارک کی تعریف کے ساتھ ساتھ آپؐ کی شخصیت کے مطابق اس کی پاکیزگی اور تقدس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ستائیسویں شعر میں حضورؐ پاک کے رخسارِ مبارک کی آب و تاب کا بیان ہے۔ یعنی آپؐ کے رخساروں کی چمک بہت تیز ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپؐ کے رخسار میں ایسی آب و تاب ہے گویا اس سے شعلے نکل رہے ہیں۔ اس شعلۂ رخسار میں ایسا حسن و جمال ہے اور ایسی خوب صورتی ہے کہ آسمان پر چمکنے والی بجلی گویا اس کے رشک میں روتی رہتی ہے اور رونے کے وقت برق اپنے چہرے کو بادل کے پلّو سے ڈھک لیتا ہے۔ اس شعر میں حسن تعلیل ہے۔ اٹھائیسویں شعر میں کہا گیا ہے کہ ہمارے

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

حضورؐ کے لبوں میں جاں بخشی کی صفت پائی جاتی ہے یعنی ان کے ذریعے سے انسان کی جان کو امان مل جاتی ہے اور اس کی شہرت دُور دُور تک جا پہنچی ہے۔ اس لیے بادل کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اے بادل! اگر تجھے اس میں کچھ شک وشبہہ ہے تو حضرت عیسیٰ سے دریافت کرلے اور سن لے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ یعنی وہ بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ نبیؐ کے ذریعے عوام الناس کی جان بخشی ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کا معجزہ مُردوں کو زندہ کرنا تھا۔ انتیسویں شعر میں حضور پاک ﷺ کے دندانِ مبارک کی توصیف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے بادل! اگرچہ تیرا دُرِ یکتا یعنی نایاب اور قیمتی موتی بھی اپنی مثال آپ ہے لیکن انصاف کی نگاہ سے دیکھ کر بتا کہ کیا وہ حضورؐ پاک کے دندان مبارک کے مماثل ہوسکتا ہے یعنی وہ کبھی حضور ﷺ کے دانتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ اس جیسا ہوسکتا ہے۔

تیسواں شعر منظر کشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ شب معراج میں آسمان سے درِ اقدس تک فرشتوں کا ایسا تانتا بندھا ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے بادل عرش معلیٰ کی طرح بن گیا تھا یعنی تسلسل کے ساتھ فرشتے آسمان سے نازل ہورہے تھے جیسے بادل سے لگاتار پانی برستا ہے۔ یعنی عرش معلیٰ کے فرشتے حضورؐ پاک کے استقبال کے لیے بادلوں پر اُتر آئے تھے۔ اکتیسویں شعر میں کہا گیا ہے کہ ہمارے حضور پاک ﷺ نے ساری کائنات میں دین اسلام کا ڈنکا بجایا یعنی اس کے پیغام کو ساری دنیا میں عام کردیا۔ آپؐ کی رسالت کا بادل کسی خاص علاقے کے لیے نہیں تھا بلکہ ساری دنیا کے لیے عام تھا جس نے بلا تفریق ہر خاص وعام کو سیراب کیا۔ بتیسویں شعر میں کہا گیا ہے کہ اے حضور پاک ﷺ آپؐ کی دودھاری تلوار نے دین اسلام کو چمکایا یعنی آپؐ کی بہادری کی وجہ سے ہر طرف دین اسلام کی شہرت ہوئی اور اس کا ڈنکا بجا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس دین اسلام کو قبلے کی جانب سے بادل نے کاندھا دیتے ہوئے اوپر اٹھالیا۔ یعنی یہ دین شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا اور اس کا چرچا ہر جگہ عام ہوگیا۔ چوں کہ پورا قصیدہ برسات کے حوالے سے ہے، اس لیے تینتیسویں شعر میں حضور پاک ﷺ کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ آپؐ کی چوکھٹ کا زمانے میں وہ رتبہ ہے کہ بادل بھی اگر ادھر سے گزرتا ہے تو کاندھا جھکائے ہوئے گزرتا ہے یعنی باادب ہوکر سامنے سے نکلتا ہے۔ چونتیسویں شعر میں حضور پاک ﷺ کی شجاعت اور سخاوت کا بیان کیا گیا ہے اور دونوں کے لیے دو استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ہمارے حضور پاک ﷺ کی تلوار بہادری کے میدان میں چمکتی ہوئی بجلی کی طرح ہے اور آپؐ کا مبارک ہاتھ سخاوت کے چمن میں برستے ہوئے بادل کی طرح ہے۔ یعنی آپؐ نہایت بہادر اور نہایت سخی ہیں۔

پینتیسواں شعر مطلع کا ہے۔ اس میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اے حضور پاک ﷺ آپؐ کی سرکار سب سے اعلیٰ اور افضل ہے اور میرے ایمانِ مفصل کا یہی اجمال یعنی خلاصہ ہے۔ چوں کہ کلمے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک کو ایمان مجمل اور دوسرے کو ایمان مفصل کہتے ہیں۔ ایمان مفصل میں جن چیزوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے، ان کا ذکر تفصیل سے ہے اور ایمان مجمل میں اختصار سے۔ اس لیے شاعر نے ان دو کلموں کے نام کو خاص طور سے

استعمال کیا ہے۔چھتیسویں شعر میں شاعر نے یہ دعا کی ہے کہ دین ہو یا دنیا، مجھے آپؐ کے علاوہ کسی اور کا سہارا نہ لینا پڑے یعنی میں دنیا میں کسی کا محتاج نہ رہوں۔ میں اگر بھروسا کروں تو صرف آپؐ کی ذات پر کیوں کہ آپؐ کی ذات سے بہتر بھروسہ کرنے والی کوئی ذات دنیا میں ہے ہی نہیں۔اس لیے مجھے صرف آپؐ کی طاقت وقوت پر بھروسہ ہے۔ سینتیسویں شعر میں شاعر نے اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ مرتے دم تک میرا دھیان آپؐ ہی کی ذات پاک میں لگا رہے۔ یہاں تک کہ جب موت آجائے تو آپؐ ہی کی شکل مجھے دکھائی دے۔شاعر کی یہ شدید خواہش ہے کہ آخری سانس تک حضور پاکؐ کے خیال اور ان کی یاد میں وہ مصروف رہے اور مرتے وقت آپؐ کی صورت سامنے ہو تو اس سے حسین موت اور کیا ہو سکتی ہے۔اڑتیسویں شعر میں شاعر نے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میری یہ بھی خواہش ہے کہ حضور پاک ﷺ میرے مرنے کے وقت ہی میری شفاعت کا اشارہ فرمادیں کہ اے محسن کل یعنی قیامت کی فکر نہ کرنا جو ہوگا وہ دیکھ لیا جائے گا۔ چوں کہ نبیؐ شافعِ محشر ہیں اور اپنی امت کی شفاعت فرمائیں گے، لہٰذا شاعر رسولِ خدا سے پوری امید رکھتا ہے اور اس کی تمنا ہے کہ حضورؐ پاک اس کی شفاعت کریں گے۔

8.3.4 ماحصل

اُردو قصیدہ نگاری کی روایت میں محسن کاکوروی کا نام اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ وہ ایک نعتیہ قصیدہ نگار ہیں۔انھوں نے ۵ نعتیہ قصائد اُردو دنیا کو دیے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ رندانہ اور بہاریہ تشبیب، مقامی رنگ، ہندوستانی تلمیحات، رسوم ورواج، فارسی اور عربی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت الفاظ کی آمیزش،لکھنؤ کا رکھ رکھاؤ، جوشِ عقیدت میں ڈوبی ہوئی مدح، معنی آفریں گریز، پُرخلوص مناجات، بیان میں برجستگی اور روانی، تعریف اور اظہار میں مبالغہ،شوکتِ الفاظ، تخیل کی بلند پروازی اور ندرتِ خیال ان کے قصائد کے امتیازی اوصاف ہیں جن سے ان کی ایک الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔ان کا سب سے عمدہ قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلین' ہے۔ پورا قصیدہ سرورِ کائنات کی تعریف اور شان میں ہے اور ہندوستانی تہذیب میں مکمل طور پر رچا بسا ہوا ہے۔اس کی یہی خصوصیت قصیدے کی تاریخ میں اسے امتیازی شان عطا کرتی ہے۔ ہندی لفظیات اور تراکیب کے استعمال نے اسے خوب صورت اور انوکھا بنا دیا ہے۔قصیدہ کی خوب صورتی اس کی پیش کش میں ہے۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے :

- محسن کاکوروی کے سوانحی احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- محسن کاکوروی کی قصیدہ نگاری سے بحث کی۔

- محسؔن کاکوروی کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- محسؔن کاکوروی کے قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلین' کے منتخب اشعار کی قرأت کی۔
- محسؔن کاکوروی کے قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلین' کے منتخب اشعار کی تشریح کو سمجھا۔

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ محسؔن کاکوروی کے سوانحی احوال و کوائف سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

۲۔ محسؔن کاکوروی نے کل کتنے قصائد تحریر کیے؟

۳۔ محسؔن کاکوروی کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے بحث کیجیے۔

۴۔ محسؔن کاکوروی کے مشہور قصیدہ 'مدیحِ خیر المرسلین' کا تعارف پیش کیجیے۔

۵۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

دین و دُنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہو بھروسا تری قوت ترا بل

آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تادمِ مرگ
شکل تیری نظر آئے، مجھے جب آئے اجل

دمِ مُردن یہ اشارہ ہو شفاعت کا مری
فکر فردا کی نہ کر، دیکھ لیا جائے گا کل

8.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ محسؔن کاکوروی ۱۸۲۶ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی حسن بخش شاعر اور باکمال مصنف تھے۔ محسؔن کاکوروی کی پرورش دادا مولوی حسین بخش کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اور ان سے ہی انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اپنے دادا کی شہادت کے بعد محسؔن اپنے والد کے ساتھ مین پوری میں رہے جہاں انھوں نے اپنے والد اور مولوی عبدالرحیم سے تحصیل علم کی۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ہائی کورٹ میں وکالت کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کی اور آگرہ میں عدالتی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ بعدازاں وہ متھرا میں منصف مقرر ہوئے۔ جب ان کے بھائی انوار الحسن نے ایل۔ ایل۔ بی مکمل کیا تو محسؔن نے وکالت، کاروبار اور زمین داری سے بے تعلقی اختیار کر لی اور شعر و شاعری، تصنیف و تالیف اور مطالعے میں انھوں نے خود کو مصروف کر لیا۔ محسؔن کاکوروی

بلند اوصاف کے حامل تھے۔۴اپریل ۱۹۰۵ءکو اسہال کبدی میں مبتلا ہوئے۔ بالآخر ۱۸صفر۱۳۲۳ھ مطابق ۲۴اپریل ۱۹۰۵ءکو دس بجے دن میں آپ کا انتقال مین پوری میں ہوا اور والد مولوی حسن بخش مرحوم کے مزار کے قریب آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

۲۔ محسنؔ کاکوروی کے کلیات میں کل پانچ نعتیہ قصائد ہیں۔ان قصیدوں کے تاریخی نام 'گلدستہ کلامِ رحمت' (۱۲۵۸ھ)، 'ابیاتِ نعت' (۱۲۴۴ھ)، 'مدیحِ خیرالمرسلین' (۱۲۹۳ھ)، 'نظمِ دل افروز' (۱۳۱۸ھ) اور 'انیسِ آخرت' (۱۳۲۲ھ) ہیں۔

۳۔ الفاظ کی شان وشوکت، تخیل کی بلند پروازی، بندش کی چُستی، بیان میں شگفتگی، ندرتِ مضمون، مبالغہ آرائی، ہندوستانی تہذیب کی عکاسی، معنی آفرینی، جوشِ بیان، تسلسل اور روانی محسنؔ کاکوروی کے قصائد کی خصوصیات وامتیازات ہیں۔

۴۔ محسنؔ کاکوروی کا مشہور قصیدہ 'مدیحِ خیرالمرسلین' لامیہ اور غیر مردف قصیدہ ہے۔ یہ قصیدہ عرفیؔ کی زمین میں ہے۔محسنؔ نے اس کا نام 'مدیحِ خیرالمرسلین' رکھا ہے۔ اُردو میں یہ قصیدہ شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں ہندوستانی اساطیر، ہندوروایات، صنمیات، عقائد، ہندو مذہب، ہندوستانی تہذیب اور دیگر تلمیحات کا ذکر ہے۔ پورا قصیدہ نبی کریم ﷺ کی شان میں ہے۔ اُردو، عربی، ہندی، فارسی اور سنسکرت کا حسین امتزاج اس قصیدہ کی جان ہے۔

۵۔ ان اشعار میں سے پہلے شعر میں شاعر نے یہ دعا کی ہے کہ دین ہو یا دنیا، مجھے آپؐ یعنی حضورؐ پاک کے علاوہ کسی اور کا سہارا نہ لینا پڑے یعنی میں دنیا میں کسی کا محتاج نہ رہوں۔ میں اگر بھروسا کروں تو صرف آپؐ کی ذات پر کیوں کہ آپؐ کی ذات سے بہتر بھروسہ کرنے والی کوئی ذات دنیا میں ہے ہی نہیں۔اس لیے مجھے صرف آپؐ کی طاقت وقوت پر بھروسہ ہے۔دوسرے شعر میں شاعر نے اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ مرتے دم تک میرا دھیان آپؐ ہی کی ذات پاک میں لگا رہے۔ یہاں تک کہ جب موت آجائے تو آپؐ ہی کی شکل مجھے دکھائی دے۔شاعر کی یہ شدید خواہش ہے کہ آخری سانس تک حضور پاکؐ کے خیال اور ان کی یاد میں وہ مصروف رہے اور مرتے وقت آپؐ کی صورت سامنے ہو تو اس سے حسین موت اور کیا ہوسکتی ہے۔آخری شعر میں شاعر نے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میری یہ بھی خواہش ہے کہ حضور پاک ﷺ میرے مرنے کے وقت ہی میری شفاعت کا اشارہ فرما دیں کہ اے محسنؔ کل یعنی قیامت کی فکر نہ کرنا جو ہوگا وہ دیکھ لیا جائے گا۔ چوں کہ نبیؐ شافعِ محشر ہیں اور اپنی امت کی شفاعت فرمائیں گے، لہٰذا شاعر رسولِ خدا سے پوری امید رکھتا ہے اور اس کی تمنا ہے کہ حضورؐ پاک اس کی شفاعت کریں گے۔

8.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
گوکل	:	متھرا کے قریب ایک خوب صورت جگہ کا نام، کرشن جی کی پیدائش کا مقام
طول امل	:	لمبی آرزو
مہابن	:	متھرا کے قریب ایک جگہ
تیرتھ	:	مذہبی مقامات کی زیارت
ترسابچہ	:	آتش پرست کی اولاد
دُھر	:	اعلیٰ درجہ
تلاطم	:	موجوں کا اٹھنا
گوپی	:	گوالن، کرشن جی کے ساتھ بچپن میں کھیلنے والی گوالوں کی لڑکیوں میں سے ہر ایک کا لقب
سلونوں	:	رکھشا بندھن
ہنڈولا	:	برسات کے مہینے میں لگنے والا میلہ، برسات کا گیت جو جھولے پر گایا جاتا ہے
مُحافہ	:	ڈولی
بہل	:	بیلوں کا یکّہ
بڑھوامنگل	:	بنارس کا ایک میلہ جو منگل کو لگتا ہے
بھبھوت	:	وہ راکھ جو جوگی یا سنیاسی اپنے بدن پر مَلتے ہیں
نرگس شہلا	:	سیاہی مائل نرگس کے پھول
احول	:	بھینگا
گُلبن	:	پھولوں کا جنگل، جہاں پھول دار درختوں کی کثرت ہو، گلستاں
گلگوں	:	گلاب کے رنگ کا، گلابی، سرخ
کوتل	:	زیب و زینت سے آراستہ گھوڑے، سجائے ہوئے گھوڑے
گلابی	:	شراب، گلابی رنگ
صریرِ نے کلک	:	قلم کی نوک کی آواز
نَے	:	بانسری
طرّہ	:	کلغی
متین	:	مضبوط

تنزیہہ	:	عیب سے پاک کرنا، صاف کرنا، پاکی، صفائی
بے رنگی مطلق	:	یعنی اللہ کے لیے کوئی جگہ اور کوئی سمت متعین نہیں کی جا سکتی
بحر امکاں	:	پوری کائنات
در یتیم	:	قیمتی اور بڑا موتی
ہفت اقلیم	:	ساری دنیا

8.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	کلیات نعت محسن (مرتبہ)	:	مولوی محمد نور الحسن
۲۔	قصیدہ کا فن اور اُردو قصیدہ نگاری	:	ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین
۳۔	اُردو میں قصیدہ نگاری	:	ڈاکٹر ابو محمد سحر
۴۔	اُردو قصیدہ نگاری (مرتبہ)	:	ڈاکٹر اُمِّ ہانی اشرف
۵۔	انتخاب قصائد (مرتبہ)	:	مہ لقا اعجاز
۶۔	مرزا محمد رفیع سودا (مونوگراف)	:	پروفیسر قاضی افضال حسین

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY